دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۹ ماہ جمادی الاخریٰ ۱۴۳۳ھ مطابق ماہ اپریل ۲۰۱۲ء عدد ۴

فہرست مضامین

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

ایک سال سے زیادہ کا طویل عرصہ گذر گیا لیکن نہ تو بشارالاسد کی خون کی پیاس بجھی اور نہ شامی عوام کے جذبہ سرفروشی میں کوئی کمی آئی۔ بہار عرب جہاں سے بھی گذری خون کا خراج لیتے ہوئے گذری لیکن شام میں تو اس انداز سے آئی کہ پوری مملکت میں لہو کی ندیاں بہ گئیں۔ حما کے قاتل کے بیٹے نے نہ صرف اپنے قابل نفرت باپ کی وراثت کا حق ادا کر دیا بلکہ خون آشامی کی اس روایت کو ان حدوں تک پہنچا دیا جہاں تک جانے کی حافظ الاسد خود بھی شاید جرأت نہ کرتا۔ اس نے شام کی ہر قابل ذکر بستی کو حما میں تبدیل کر دیا اور اس میں خود حما کی دوسری تباہی بھی شامل ہے۔ اس نے خود اپنے شہریوں کے خلاف ٹینکوں اور توپوں کے دہانے کھول رکھے ہیں اور مہینوں سے یہ بمباری مسلسل جاری ہے۔ کتنی ہی زندگیاں خاک کی رزق بن چکی، بشار کے حفاظتی دستوں کے ہاتھوں نہ تو کسی کی جان محفوظ ہے اور نہ آبرو۔ اور پوری دنیا اس خون چکاں منظر کی خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے، اقوام متحدہ کے سابق سکریٹری جنرل کوفی عنان کو فروری کے اواخر میں اقوام متحدہ اور عرب لیگ کے نمائندہ کے طور پر شام کا مسئلہ حل کرنے کے لیے منتخب کیا گیا تو بعض حلقوں میں اس امید کا اظہار کیا گیا کہ شاید اس سنگین بحران کے حل کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ لیکن جو لوگ کسی قدر زمینی حقائق کا ادراک رکھتے تھے انہوں نے ابتداء ہی سے اس مشن کو ناممکن قرار دے دیا تھا۔ ۱۶ مارچ کو کوفی عنان نے اپنا شش نکاتی منصوبہ پیش کیا جس کا بنیادی مقصد جنگ بندی کا نفاذ تھا۔ اس کی دوسری دفعات حکومت کو اس بات کی پابند بناتی تھیں کہ وہ اپوزیشن کے خلاف تعینات فوج اور بھاری اسلحہ کو واپس بلائے، قیدیوں کو رہا کرے، پرامن احتجاج کی اجازت اور عوام کی آرزوؤں اور امنگوں کو بارآور ہونے کے مواقع فراہم کرے۔ ۱۲ اپریل کو یہ منصوبہ نافذ ہوا اور ۲۱ اپریل کو سیکوریٹی کونسل نے ۹۰ دنوں کے لیے مملکت میں ۳۰۰ غیر مسلح مبصر متعین کرنے کی متفقہ تجویز پاس کی UNSMIS (UN Supervision Mission in Syrea) کے کچھ اہل کار شام پہنچ بھی چکے ہیں۔ لیکن ابتداء ہی سے اس مشن کی کامیابی کے سلسلہ میں شک کا اظہار کیا جاتا رہا ہے۔ اس مشن کا کام کسی ایسی جنگ بندی کی نگرانی کرنا نہیں ہے جو عملاً نافذ ہے بلکہ دراصل اسے جنگ بندی کا اہتمام بھی کرنا ہے اور موثر نگرانی کے ذریعہ اسے کامیابی سے ہم کنار کرنا بھی۔ شام میں پائے جانے والے حالات کی روشنی میں اگر اس کے امکانات یکسر معدوم نہیں تو بھی خاصے کم ہیں۔ ایک لاکھ اسی ہزار مربع کیلومیٹر پر محیط پہاڑوں، صحراؤں، شہروں اور دیہاتوں میں پھیلی ہوئی

۲۳ملین آبادی والے اس ملک میں اقوام متحدہ کے ۳۰۰ غیر مسلح مبصر کس طرح یہ کام انجام دے سکیں گے۔ خاص طور سے اس صورت میں جب خود حکومت اس سلسلہ میں مخلص نہ ہو۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ شہریوں کے خلاف شامی فوج کا تشدد بدستور جاری ہے اور خود کوفی عنان نے اس صورت حال کو ناقابل قبول قرار دیا ہے۔ آبادیوں سے نہ تو فوج واپس ہوئی ہے اور نہ بھاری اسلحے۔ کئی جگہوں پر مبصرین کے معائنہ کے بعد مقامی آبادی کو فوج کی انتظامی کارروائی کا سامنا کرنا پڑا۔ آزاد ذرائع کے مطابق ابھی تک کم وبیش چودہ ہزار افراد موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں جن میں خواتین اور بچوں کی ایک معتد بہ تعداد شامل ہے۔ بیس ہزار سے زیادہ لوگ جیلوں میں بدترین ایذا رسانی کا شکار ہیں اور اس سے بھی زیادہ لاپتہ ہیں۔ واضح طور پر بشار الاسد اپنے اقتدار کی حفاظت کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتا ہے۔ لیکن جتنی جلد اس کو اس حقیقت کا ادراک ہوجائے خود اس کے لیے اتنا ہی بہتر ہے کہ اب وقت کے دھارے کو موڑ ناممکن نہیں۔ وہ اپنی بے رحم فوجی مشین کے ذریعہ مزید بے شمار لوگوں کو ہلاک کرسکتا ہے لیکن شامیوں کے دلوں میں موج زن جذبہ آزادی کو ختم نہیں کرسکتا۔ اب شامی قوم سود وزیاں کے حساب سے اوپر اٹھ چکی ہے اور قوموں کی زندگی میں جب یہ وقت آجاتا ہے تو وہ ناقابل تسخیر ہوجاتی ہیں۔

مصر میں حسنی مبارک کے عہد نامسعود کا خاتمہ تو ہوگیا لیکن جدید مصر کی تاریخ کا یہ غیر معمولی واقعہ ہنوز اپنے منطقی انجام کو نہیں پہنچ سکا ہے۔ اسلام دشمن طاقتیں حسنی مبارک کو بچانے میں تو کامیاب نہ ہوسکیں لیکن اسرائیل کی بقا اور تحفظ کے لیے مصر کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر وہ اتنی آسانی سے اس سے دست بردار بھی نہیں ہوسکتی تھیں۔ گذشتہ فروری میں جب حسنی مبارک کے زوال کے بعد سپریم ملٹری کونسل نے زمام اقتدار سنبھالی اس وقت بھی باخبر حلقوں میں فوج کے سلسلہ میں خاصے تحفظات پائے جاتے تھے۔ لیکن اس وقت شاید اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں تھا۔ تحفظات کے اسباب واضح تھے۔ مصر کی جدید تاریخ کے تینوں ڈکٹیٹر جمال عبدالناصر، انور سادات اور حسنی مبارک فوجی پس منظر سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے اسی کے ذریعہ حکومت حاصل کی تھی اور تمام تر عوامی نفرت کے باوجود اسی کے سہارے اتنی طویل مدت تک اقتدار پر قابض رہے۔ فوج کے اعلیٰ افسروں کے پنٹاگان، سی آئی اے اور موساد سے گہرے تعلقات رہے ہیں، فلسطینیوں کے مقاصد سے غداری کرنے، اسرائیل کو تسلیم کرنے، اس سے قریبی تعلقات رکھنے اور اسے ہر طرح کی امداد پہنچانے، امریکی مفادات کی پاس داری کرنے اور غزہ کے مظلوم فلسطینیوں کے اوپر عرصہ حیات

تنگ کرنے کی ناپاک کوشش میں اسرائیل سے بھرپور تعاون کرنے اور اس نوع کی دوسری خدمات کے عوض امریکہ سے تقریباً دو بلین ڈالر ملنے والی سالانہ امداد کا ایک معتد بہ حصہ فوجی قیادت کی جیب میں پہنچتا رہا ہے۔ ملک میں وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے کرپشن میں فوج کی بڑی حصہ داری رہی ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ اور اسرائیل کی طرف سے نوازشوں اور الطاف وعنایات کے اور بھی سلسلے تھے فوج جن کی اسیر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ فوج کی طرف سے جمہوریت کی بحالی کے عمل میں مشکلات پیدا کی گئیں۔ اگر مصری عوام بیدار نہ رہے ہوتے تو بعید نہیں تھا کہ حسنی مبارک کی جگہ فوج نے لے لی ہوتی اور ظلم و جبر کی سیاہ رات یوں ہی مصر پر محیط رہتی۔ اس کے باوجود مصری انقلاب ابھی تشنۂ تکمیل ہے اور بظاہر ہر ممکن کوشش اس بات کی کی جارہی ہے کہ کرسیِ صدارت تک جس کے لیے ۲۳۔۲۴ مئی کو انتخابات ہونے والے ہیں، کسی ایسے شخص کی رسائی نہ ہو سکے جس کے ہاتھ میں ان طاقتوں کے مفادات غیر محفوظ ہوں۔ چنانچہ صدارت کے سب سے نمایاں امیدوار الاخوان المسلمون کے خیرت الشاطر کو، جن کی کامیابی کے امکانات بظاہر سب سے زیادہ تھے، اس وجہ سے نااہل قرار دے دیا گیا کہ انہیں حسنی مبارک کے دور میں، جس میں اسلام پسند کیسی کیسی آزمائشوں سے نہیں گذرے، جیل کی سزا ہوئی تھی۔ حالانکہ عموماً جابرانہ حکومتوں کے زوال کے بعد فطری طور پر زمام اختیار وہی لوگ سنبھالتے ہیں جو اپنی باغیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے ان کے ظلم وستم کے سب سے زیادہ شکار ہوتے ہیں۔ ظلم و جبر کے خلاف جدوجہد کے نتیجہ میں قیدوبندان کے لیے باعث ننگ نہیں ہوتی بلکہ عزت کا تمغہ ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف جب پارلیمنٹ نے بھاری اکثریت سے یہ تجویز پاس کی کہ حسنی مبارک کے دور میں جو لوگ حکومت اور حکمراں پارٹی کے اعلی عہدوں پر فائز رہے ہوں ان کو صدارتی الکشن میں حصہ لینے کی اجازت نہ دی جائے اور سپریم ملٹری کونسل نے عوامی دباؤ میں اسے منظور بھی کرلیا تو کچھ ہی گھنٹوں کے اندر الکشن کمیشن نے اسے نامنظور کردیا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ حسنی مبارک کے ستائے ہوئے خیرت الشاطر تو الکشن میں حصہ نہیں لے سکتے۔ لیکن احمد شفیق پر اس سلسلہ میں کوئی پابندی نہیں ہے جو آخری دنوں میں اس کے وزیراعظم تھے۔ مصری عوام فطری طور پر اس صورت حال سے غیر مطمئن ہیں اور اپنی ناخوشی کے اظہار کے لیے انہوں نے ایک بار پھر تحریر چوک کا رخ کیا ہے۔ توقع کی جانی چاہیے کہ مصری عوام کی قربانیاں رائگاں نہیں جائیں گی اور وہ اپنی منزلِ مراد تک پہنچنے میں کامیاب ہوں گے۔

مقالات

اسلام کا مایۂ ناز فن۔علم اسماء الرجال

ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی

اسلامی شریعت اور احکام وقوانین کے دو بنیادی سرچشمے ہیں، پہلا اور اہم سرچشمہ قرآن کریم ہے، جس کی حفاظت کا ذمہ خود اس کے نازل کرنے والے نے لے رکھا ہے، اور ہمیشہ کے لیے یہ اعلان کردیا ہے (اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ) (الحجر:۹)۔ چنانچہ چودہ صدی سے زیادہ کا زمانہ گزرنے کے باوجود آج بھی یہ اسی طرح تروتازہ ہے جیسے ابھی ابھی نازل ہوا ہو۔

دوسرا سرچشمہ احادیث نبویہ ہیں جو انتہائی محفوظ وسائل و ذرائع سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی آرہی ہیں۔ احادیث نبویہ کی حیثیت دراصل قرآن کریم کی توضیح وتشریح کی ہے، اس لیے قرآن پاک کی تفہیم اور اس کے معانی ومفاہیم تک رسائی کے لیے ان کا باقی رہنا بھی ضروری بلکہ ان کے بغیر قرآن کریم کی مراد کا سمجھنا ممکن ہی نہیں ہے، خداوند قدوس کے اپنے پاک کلام کی حفاظت کا ذمہ لینے کے ضمن میں ہی اپنے محبوب نبیؐ کی احادیث کی حفاظت کی ذمہ داری بھی آجاتی ہے، علامہ شیخ عبدالرحمٰن بن یحییٰ المعلمی یمانی لکھتے ہیں:

فاما السنة فقد تكفل الله	جہاں تک سنت کا سوال ہے تو اللہ پاک نے ان
بحفظها ايضاً لان تكفله	کی حفاظت کا بھی ذمہ لے رکھا ہے، اس لیے
بحفظ القرآن يستلزم تكفله	کہ اللہ رب العزت کا قرآن کریم کی حفاظت
بحفظ بيانه وهو السنة ،	کا ذمہ لینا مستلزم ہے اس کی شرح یعنی سنت اور
وحفظ لسانه وهو العربية ۔(۱)	اس کی عربی زبان کی حفاظت کو۔

نائب مدیر مجلّہ ''المآثر''، مئو، یوپی۔

اس ضرورت کے تحت حدیث وسنت کی حفاظت وصیانت کا ایسا حیرت انگیز انتظام ہوا، جو درحقیقت ایک الہامی انتظام ہے اور ایک ایسی ایجاد ہے جو پوری انسانی تاریخ میں بے نظیر اور نادرالوجود کارنامے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں نے آپؐ کے افعال واقوال، عادات واطوار، اخلاق و کردار، نشست و برخاست، رفتار وگفتار، خلوت وجلوت کے واقعات، معاشرت و معاملات اور آپؐ کے طور طریق کو اس طرح محفوظ رکھا ہے کہ اس کے نقوش آج بھی بدرجۂ کمال روشن وتابندہ اور بے داغ ہیں، جن کو دیکھ کر دنیا انگشت بدنداں اور تاریخ کی نگاہیں خیرہ ہیں۔ علمائے اسلام نے حدیثوں کی حفاظت واشاعت کے لیے کس قدر جانفشانی اور آبلہ پائی اور کیسی کیسی مشقتیں برداشت کی ہیں، اس سے تاریخ کے صفحات معمور ہیں، ان کے درس ومطالعہ سے ان کی بے پناہ قربانیوں اور جانفشانیوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، علامہ معلمی نے لکھا ہے:

> ''بہت سے لوگ عادت ڈالنے کے لیے اپنے جگر گوشوں اور دل کے ٹکڑوں کو ان کے بچپن ہی میں سماع حدیث کی مجلسوں میں لے جاکر بٹھا دیا کرتے تھے، پھر جب کوئی بچہ بڑا ہوتا، تو پہلے اپنے شہر میں، وہاں کے محدثین سے۔ حدیثوں کو حاصل کرتا، پھر دوسرے علاقوں کے لیے رخت سفر باندھتا، دور دراز کا سفر کرتا اور سخت ترین مشقتیں برداشت کرتا، کبھی ایسا ہوتا کہ اس کے پاس سوائے سوکھی روٹی کی ایک تھیلی کے کچھ نہ ہوتا، اسی کو اپنی پیٹھ پر اٹھائے ہوتا ،صبح ہوتی تو اس روٹی کا ایک ٹکڑا لے کر پانی میں بھگو دیتا اور اس کو حلق سے اتار کر حدیث سننے کے لیے نکل پڑتا۔ محدثین کے اس قسم کے بہ کثرت واقعات کتابوں میں موجود ہیں''۔(۲)

سند کی اہمیت: حدیثوں کی حفاظت وصیانت کے اس طریقہ اور فن کو علم الاسناد کے نام سے جانا جاتا ہے۔ علوم دینیہ میں سند کو بے پناہ اہمیت حاصل ہے، احادیث نبویہ کا دارومدار سندوں پر ہی ہوتا ہے، کسی حدیث کی صحت وسقم کو معلوم کرنے کے لیے سب سے پہلے اس کی سند ہی کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے، اس کے بعد اس روایت کی حیثیت متعین کی جاتی ہے اس کی اسی اہمیت کے سبب مسلمانوں نے اس کے ساتھ جو اہتمام کیا ہے، دنیا کی تمدنی وثقافتی تاریخ میں اس

کی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے:

الاسناد من خصائص هذه الامة ، وهو من خصائص الاسلام ، ثم هو فی الاسلام من خصائص اهل السنة۔(۳)	اسناد اس امت کی خصوصیات میں سے ہے اور وہ اسلام کی بھی خصوصیات میں سے ہے، پھر دین اسلام میں بھی یہ چیز اہل سنت کی خصوصیات میں سے ہے۔

مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے مواہب لدنیہ کے حوالے سے ایک محدث کا یہ قول نقل کیا ہے:

سمعت محمد بن حاتم بن المظفر يقول : إنَّ اللّٰهَ تعالی قد اکرمَ ہذه الامۃَ وشرَّفها وفضَّلها بالاسناد ، وليس لاحد من الامم کلِّها قديمِها وحديثها اسناد موصول ، إنما هو صُحُف فی ايديهم ، وقد خَلَطوا بکُتُبهم اخبارَهم۔(۴)	اللہ تعالی نے اس امت کو اسناد جیسی عظیم نعمت عنایت فرما کر اس کو فضیلت و سرفرازی عطا فرمائی، دوسری کسی بھی قوم کے پاس خواہ وہ قوم قدیم ہو یا جدید، سند متصل کا وجود نہیں ہے، ان کا کل سرمایہ بس چند مذہبی کتابیں اور نوشتے ہیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ انہوں نے اپنی کتابوں میں اپنے واقعات خلط ملط کردیے ہیں۔

شیخ ابوغدہؒ نے بھی لمحات من تاريخ السنة وعلوم الحديث اور الاسناد من الدين میں اس طرح کے متعدد اقوال جمع کیے ہیں، ڈاکٹر محمود طحان لکھتے ہیں:

الاسناد خصيصة فاضلة لهذه الامة ، وليس للأمم السابقة هذه الخصيصة ، ولذلک ضاعت وحرفت کتبها السماوية ، کما ضاعت اخبار انبيائها الصحيحة ، وحل محلها کذب الدجالين وافتراءات	اسناد اس امت کی نمایاں خصوصیت ہے، اس سے پہلے کی امتوں کو یہ خصوصیت حاصل نہیں ہوئی، جس کی وجہ سے ان کی آسمانی کتابیں ضائع ہوئیں اور ان میں تحریف ہوئی، جیسا کہ ان کے پیغمبروں کی صحیح خبریں۔ گزشتہ انبیاء کی حدیثیں ضائع ہوگئیں اور ان خبروں کی جگہ جعل سازوں کی دروغ بیانی اور ان سوداگروں

المستغلين الذين يشترون بآيات اللّٰه ثمنًا قليلًا ۔ (۵)

کی افتراپردازی نے لے لی جو معمولی سی قیمت پر خدا کی آیات فروخت کردیتے ہیں۔

علم جرح وتعدیل: سند کے بغیر کوئی حدیث قابل قبول اور لائق اعتنا نہیں ہوسکتی اور ازروئے سند کسی حدیث کی قوت وضعف، صحت وسقم اور اس کا حکم معلوم کرنے کے لیے علم جرح و تعدیل اور اس کے اصول وقواعد سے واقفیت ضروری ہے، اس کے بغیر کسی روایت کا مقام ومرتبہ معلوم نہیں ہوسکتا اور چونکہ سند کی معرفت کا دارومدار اسی علم پر ہوتا ہے، اس لیے اسلامی علوم وفنون میں یہ فن نمایاں مقام اور اسماء الرجال کے نام سے شہرت رکھتا ہے، اس علم کی بنیادیں خود قرآن و حدیث میں موجود ہیں اور ان بنیادوں پر علمائے اسلام نے جو عمارت کھڑی کی وہ اپنی عظمت و بلندی میں آسمان کے ہم عنان نظر آتی ہے۔ دکتور احمد محمد نور سیف لکھتے ہیں:

لقد كان لعلماء الحديث اكبر الفضل في الجهود التي بذلت في الاحتياط، والتثبت، والتنقيب عن احوال الرجال، وكل ما يتصل بهم، وعن الاحاديث، وكل ما يعرض لها من وهم، او خلل، واستطاعوا بتلك الجهود الضخمة، ان يوجدوا هذا العلم الفريد، والذى غدا مفخرة من مفاخر الاسلام، اعترف بفضله، و جدواه، ودقته، ومتانته النقدية في معايير المقاييس العلمية

حدیثوں کے سلسلے میں احتیاط وتحقیق، راویوں کے حالات اور ان سے متعلق امور میں بحث وتمحیص، احادیث اور ان میں بھول چوک یا الٹ پھر کے امکان کی چھان بین کے لیے جو کوششیں بروئے کار لائی گئی ہیں، ان میں بہت بڑا حصہ محدثین کا ہے، انہوں نے زبردست کوششوں سے اس بے مثال علم کو ایجاد کیا جو اسلام کا سرمایۂ افتخار ہے، جس کی فضیلت، افادیت وباریکی اور سائنٹفک معیار پر اس کی تنقیدی متانت کا اعتراف دوستوں سے پہلے دشمنوں نے کیا ہے۔

الاعداء قبل الاصدقاء ۔(۶)

راویوں کے انتخاب میں اہل علم کس قدر تفحّص اور شدت احتیاط سے کام لیتے تھے، اس حقیقت کا ذکر علامہ معلّمی یمانی نے اس طرح کیا ہے:

''اہل علم راویوں کے انتخاب میں انتہائی احتیاط اور شدت سے کام لیتے تھے، بعض لوگوں کا یہ قول منقول ہے - غالباً حسن بن صالح بن حی کا قول ہے - کہ جب ہم کسی سے حدیث سننے کا ارادہ کرتے تھے، تو اس کا حال معلوم کرتے تھے، یہاں تک کہ کہا جاتا کہ کیا وہاں رشتہ کرنا چاہتے ہیں'' ۔(۷)

روایتوں کی تمحیص وتنقید: فن اسماء الرجال کی ایجاد، اس کی تدوین وترتیب اور اشاعت وترقی مسلمانوں کا قابل فخر کارنامہ اور دین اسلام کے فرق کمال کا بیش قیمت تاج ہے، مسلمانوں نے اس علم کو فروغ دے کر نہ صرف اپنے نبیؐ کی سنت وسیرت کو کسی بھی قسم کی آمیزش اور ناروا تصرف سے محفوظ کر دیا ہے، بلکہ انھوں نے دنیا کے سامنے نقد ونظر کا ایک ایسا معیار اور پیمانہ رکھ دیا ہے، جو آئینے کی طرح صاف، ستھرا اور شفاف ہے، اور جس سے زیادہ سچا اور کھرا کوئی معیار نہیں ہوسکتا، ڈاکٹر احمد نور سیف لکھتے ہیں:

''مورخین اور معاصر مستشرق محققین وغیرہ نے حقائق کی تلاش وجستجو اور تاریخی دستاویزات کی تنقید کے لیے مسلمانوں کی ایجاد کردہ اسی کسوٹی پر اعتماد کیا ہے، اگرچہ ان کا عمل ان پیمانوں کا مکمل احاطہ نہیں کر سکا، اور سوائے چند محدود پہلوؤں کے اس سے استفادہ نہیں کر سکا'' ۔

فن اسماء الرجال کے ارتقا اور اس کی تصانیف پر گفتگو سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس فن کی ایجاد واختراع اور اس کے فروغ کے لیے غیر معمولی کدوکاوش کی ضرورت پر سرسری نظر ڈال لی جائے ۔ یہ فن دراصل تنقید کی ضرورت کے پیش نظر عالم وجود میں آیا ہے، علم اسماء الرجال کی طرح فن نقد کو بھی مسلمانوں نے وسعت وترقی عطا کی، اس فن کے ذریعہ علماء جرح وتعدیل نے راویانِ حدیث کی بے لاگ جرح وتعدیل اور آثار وروایات کی نہایت منصفانہ بحث وتمحیص اور معروضی تنقید کا معیار ومیزان قائم کیا ۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی امت کو

احادیث کی حفاظت وصیانت اور کسی طرح کی آمیزش سے ان کو محفوظ رکھنے کا جو پیغام بلکہ حکم دیا تھا، امت کے علماء اور ماہرین فن نے اس کی تعمیل میں ذرہ برابر بھی غفلت ولاپرواہی کو راہ نہیں دی۔ آپؐ نے نہایت سخت الفاظ میں یہ فرمایا تھا: **من كذب علي متعمدا فليتبوا مقعده من النار** یعنی جو شخص جان بوجھ کر اور دانستہ طریقے سے میری طرف کوئی غلط بات منسوب کرے تو اس کو اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالینا چاہئے۔ اس سخت تنبیہ کے نتیجہ میں علماء اسلام نے احادیث وروایات کو نقد ونظر کی کسوٹی پر جانچا اور پرکھا اور پورے ذخیرۂ احادیث کو روایت ودرایت کے اصول اور تنقید کی میزان میں تول کر ان کی درجہ بندی اور فنی لحاظ سے ان کی حیثیت متعین کی۔

ماہرین فن نے روایات کی بحث وتمحیص میں جس عدل وانصاف کا مظاہرہ کیا ہے، وہ بھی کچھ کم تعجب خیز نہیں ہے، انھوں نے اس فن کی بقا وتحفظ میں کسی طرح کے تساہل اور مداہنت سے کام نہیں لیا ہے، اور اپنے عزیز وقریب اور محبوب ترین افراد تک کی بھی پروانہیں کی ہے، علی ابن المدینی سے – جو ایک اعلیٰ درجے کے محدث اور ماہر فن تھے – جب ان کے والد کی بابت دریافت کیا گیا، تو پہلے انھوں نے کہا کہ ان کے بارے میں میرے علاوہ کسی اور سے پوچھ لو، لیکن جب دوبارہ پوچھا گیا تو آپ نے بے جھجک فرمایا: **هو الدين، انه ضعيف.** یہ دین ہے، واقعہ یہ ہے کہ والد صاحب –علم حدیث کی اصطلاح میں– ضعیف ہیں۔

امام شعبہ، حدیث اور جرح وتعدیل کے ماہر اور نقد رجال میں امامت کے مقام پر فائز تھے، انھوں نے کہا کہ اگر مجھے کسی کی پاسداری کرنی ہوتی، تو ہشام بن حسان کی کرتا کہ وہ میرے بہنوئی تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا حافظہ اچھا نہیں ہے۔

اور سنن ابوداود کے مصنف نے اپنے لڑکے کی نسبت فرمایا: **ابني عبد الله كذاب.** میرا لڑکا عبداللہ بہت دروغ گو ہے۔

اس طرح کے بے شمار واقعات تذکرہ وتراجم کی کتابوں میں دیکھے اور پڑھے جا سکتے ہیں، ان پر غور کرکے انصاف اور غیر جانب داری کے ساتھ یہ فیصلہ کیا جائے کہ کیا امانت ودیانت اور منصفانہ نقد کی ایسی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ عصر حاضر کے مشہور عالم حدیث شیخ عبدالفتاح ابوغدہ مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

''حفاظ اور ناقدین حدیث نے ہر اس راوی کو جانچا پرکھا جس سے کسی غلطی کا صدور یا جس میں کوئی کمزوری نظر آئی، یا جس کے اندر تخلیط، یا اضطراب، یا زیادتی یا سہو ونسیان محسوس ہوا، خواہ وہ راوی ان کا باپ یا بھائی یا بیٹا یا رشتہ دار یا کوئی دوست ہو۔ یہ چیز ان کی بے لوث دیانت وامانت اور پاکیزگی اور ان کی نگاہ میں حدیث کی حفاظت کی قدر و قیمت کا عنوان تھی، اور ان کے نزدیک یہ آباواجداد اور اولاد وا حفاد سے زیادہ قیمتی اور بڑھ کر تھی، چنانچہ وہ لوگ اس میدان میں ضرب المثل تھے، یہ الگ بات ہے کہ وہ معصوم نہیں تھے، لیکن ان میں سے بیشتر صدق وتقوی کے زیور سے آراستہ تھے''۔(۸)

شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری توقادی نے لکھا ہے:

الطريقة المُتَّبعة في الاسلام لتوثيق الأحاديث النبوية: أفضل طريق وأعلاها، لا تُدانيها في دقتها وسُمُوِّها أي طريقة علمية غربية اتُّبعت في توثيق الروايات (۹)	احادیث نبویہ کی توثیق کے لیے اسلام میں جس طریقے پر عمل درآمد ہے، وہ نہایت بہترین اور بلندترین طریقہ ہے، اس کی دقت وباریکی اور بلندی میں مغرب کا کوئی طریقہ جس پر روایات کی توثیق کے لیے عمل کیا جاتا ہو، اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

نقد رجال کا یہی فن بعد میں علم جرح وتعدیل کے نام سے مشہور ہوا۔ فن اسماء الرجال کی طرح علم جرح وتعدیل بھی اسلام کے ساتھ مخصوص اور اسلامی فن ہونے کی حیثیت سے ممتاز ہے، چنانچہ شیخ ابوغدہ فرماتے ہیں:

ثم انَّ هذا العلمَ (علم الجرح و التعديل) مما تفرَّدتْ به الأمة الاسلامية عن سائر الأمم، وتميَّزتْ بتأسيسه وانشائه وتقعيده والتفنن فيه (۱۰)	جرح وتعدیل کا یہ علم ان علوم وفنون میں سے ہے جس کی وجہ سے امت اسلامیہ دوسری تمام قوموں سے ممتاز ہے، اور اس امت کو اس علم کی بنیاد رکھنے، اس کو قائم کرنے، اس کی ضابطہ بندی کرنے اور اس میں تفنن طبع کا مظاہرہ کرنے کا

امتیاز حاصل ہے۔

روایت و درایت کے سلسلے میں تین فن باہم اس طرح مربوط ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کی جڑ دوسرے میں پیوست ہے، اور کسی ایک کے بغیر دوسرے کے وجود کی اہمیت نہیں ہے، اور وہ ہیں: علم الاسناد، علم جرح و تعدیل اور فن اسماء الرجال۔

ان علوم کے تعارف اور ان کی تفصیل سے ہمارا مقصد صرف ان کی اہمیت کو اجاگر کرنا تھا، ذیل میں اسماء الرجال اور تذکرہ و تراجم سے متعلق کچھ معروضات پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

فن اسماء الرجال: محدثین اور حفاظ حدیث کے ذریعے احادیث کو سینوں اور سفینوں دونوں میں بیک وقت محفوظ کرنے کی کوششیں کی گئیں، حفظ احادیث کے سیکڑوں محیر العقول واقعات تذکرہ و تاریخ کے اوراق کی امانت بنے ہوئے ہیں، اس کے علاوہ محدثین نے احادیث کے نوشتے تیار کرنے کا بھی بہت اہتمام کیا۔ ایک طرف وسیع پیمانے پر احادیث کی حفاظت کا اہتمام ہو رہا تھا، دوسری طرف اسلام کی صاف ستھری اور بے داغ تعلیم کو داغ دار اور اس کی اصلی صورت کو مسخ کرنے کے لیے جعلی حدیثیں بنا کر پیغمبر اسلام - ﷺ - کی طرف منسوب کرنے کی سازش کی جا رہی تھی، وہ قومیں جن کے سینے روز اول سے اسلام کے خلاف آتش حسد میں سلگ رہے تھے اور جنھوں نے اس مذہب کے خلاف بغض و عداوت کے مظاہرہ میں کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا، اور ہر طرف سے ناکامی کے بعد اب ان کے سامنے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے احادیث کو نشانہ بنائیں، جو لوگ اس سے پہلے آسمانی کتابوں پر تحریف و تبدیل کی مشق کر چکے تھے، ان کو قرآن کریم میں تصرف کی تو کہیں سے امید نہیں نظر آ رہی تھی، البتہ احادیث نبویہ میں ردوبدل کے لیے میدان کھلے تھے اور آپؐ کے پاکیزہ اقوال اور موضوع روایات کو انہوں نے باہم خلط ملط کرنا چاہا؛ اگرچہ وضع حدیث کے بہت سے محرکات تھے، لیکن سب سے بنیادی وجہ اسلام دشمنی تھی، لیکن ان تمام سازشوں کو علماء اسلام نے اس طرح ناکام بنایا کہ ایک ایک روایت کو اصول حدیث اور جرح و تعدیل کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کی حیثیت کو واضح کر دیا اور موضوع روایات کی کوئی کوشش بارآور نہیں ہو سکی، اس سلسلہ میں علمائے اسلام

کی خدمات کا صحیح اندازہ موضوعات پر لکھی گئی کتابوں کے مطالعہ کے بعد ہی ہوسکتا ہے، دور حاضر کے عظیم ترین محدث اور ہندوستان کے مایۂ ناز عالم حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمی نے اس قسم کی نام نہاد سرگرمیوں پر محققانہ بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ہارون رشید خلیفہ عباسی (جس نے ۱۷۰ھ سے ۱۹۳ھ تک فرائض خلافت انجام دیے) کے پاس ایک بے دین لایا گیا، ہارون نے اس کے قتل کا حکم سنایا، اس نے کہا کہ اے امیر المؤمنین! آپ اُن چار ہزار حدیثوں کو کیا کریں گے، جن کو میں نے بنایا، اُن میں کا ایک حرف بھی آنحضرت (ﷺ) کا فرمودہ نہیں ہے؟ ہارون نے اس کے جواب میں کہا کہ: تجھ کو عبداللہ بن مبارک اور ابواسحاق فزاری کی بھی خبر ہے، وہ دونوں حضرات حدیثوں کی چھان بین کر رہے ہیں اور وہ موضوعات کا ایک ایک حرف نکال کر پھینک دیں گے''۔(۱۱)

خود حضرت عبداللہ بن مبارک سے جب ایک مرتبہ کہا گیا کہ ان موضوع اور جعلی حدیثوں کا کیا ہوگا؟ تو انہوں نے فرمایا: اس کے لیے ماہرین حدیث موجود ہیں، پھر یہ آیت تلاوت کی: اِنَّا نَحنُ نَزَّلنَا الذِّکرَ وِانَّا لَہٗ لَحَافِظُونَ ۔(۱۲)

ماہرین نقد ورجال نے ان موضوعات کی چھان بین اور ایک ایک روایت کا دقیقہ رسی اور باریک بینی کے ساتھ جائزہ لے کر اس کی حقیقت کا پتہ چلایا اور وضاعین کی کوئی کوشش بھی کامیاب نہیں ہونے دی، انھوں نے صرف سندوں کو نہیں بلکہ ان کے متون اور متن کے ایک ایک لفظ کو تحقیق کی میزان میں تولا، اور احادیث نبویہ مقدسہ کے ذخیرے میں ایک بھی موضوع اور جعلی حدیث نہیں رہنے دی، شیخ ابوغدہ لکھتے ہیں:

ونهض العلماء بتتبع تلك	علماء ان احادیث کے-جو دین کے نام پر وضع
الأحاديث ، وكشفوها حديثاً	کی جارہی تھیں-تحلیل و تجزیہ کے لیے کھڑے
حديثاً، ونخلوها حرفاً حرفاً ،	ہوگئے، اور ایک ایک حدیث کو کھول کر رکھ دیا،
حفظاً من الله تعالى لدينه	اور ایک ایک حرف کو جانچا پرکھا، اللہ تعالی کی
وسنة نبيه عليه الصلاة	طرف سے اپنے دین اور اپنے نبی کی سنت کی

والسلام (۱۳) حفاظت کا جو عہد لیا گیا تھا یہ اسی کا ثمرہ تھا۔

احادیث نبویہ کی حفاظت کے لیے اور اس امانت کی ادائیگی میں کسی کوتاہی کو راہ نہ دینے کے لیے محدثین کی حق گوئی اور ان کی جرأت و بے باکی کے جو واقعات ہیں، وہ نہ صرف اسلام کے زریں تمدن وثقافت کا ایک اہم حصہ ہیں، بلکہ انسانی تاریخ کے لیے بھی سرمایۂ عز ووقار ہیں، ان کی جرأت و بے باکی کا یہ حال تھا کہ علم صداقت کو بلند کرنے میں سلاطین وامراء کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے، محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمان الاعظمیؒ محدثین کی حق گوئی کے متعدد واقعات نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''اس قسم کے صدہا واقعات تاریخوں میں مذکور ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ محدثین کبھی بادشاہوں کی خوشامد میں کوئی حدیث بنانا تو درکنار، کسی خوشامدی کی ایسی حرکت دیکھ کر خاموش بھی نہ رہے، فوراً بادشاہ کے منھ پر اس کے جھوٹ ہونے کا اعلان کردیا؛ اور اسی پر منحصر نہیں، انھوں نے سلاطین کے کسی ناروا فعل کی خاموشی سے بھی حمایت نہ کی، سعید بن جبیر اور حجّاج، امام اوزاعی اور سفاح، امام ابوحنیفہ اور ابن ہبیرہ ومنصور، اور امام احمد اور معتصم کے واقعات میرے دعویٰ کی پرزور شہادتیں ہیں''۔ (۱۴)

فن رجال کے بغیر علم اسناد کا صحیح فائدہ نہیں حاصل ہوسکتا، ابتداءً اس فن کی تحصیل وتعلیم کا انحصار زبانی روایات پر رہا، پھر ائمہ حدیث وناقدین رجال نے اس پر باقاعدہ تصنیف کی ضرورت کا احساس کیا، اور اس پر یکے بعد دیگرے تصانیف وجود میں آنا شروع ہوگئیں، حضرت علامہ محدث الاعظمیؒ نے اپنے ایک مضمون میں سند کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''اس لیے اللہ رب العزت نے اسناد سے فائدہ اٹھانے کے لیے اور دین کے اس شعبہ کو قائم اور کارآمد بنانے کے لیے شروع سے اپنے بندوں میں سے کچھ باصلاحیت بندوں کو اس کام کے لیے چن لیا اور ان کو رجال کی چھان بین اور ان کے احوال کی معرفت حاصل کرنے کی توفیق بخشی، ابتدا میں تو اس فن کی تعلیم وتلقین اور علم اسماء الرجال کی فنی تربیت صرف زبانی تھی، بعد میں اس کے

ماہرین نے اس فن کو مدوّن کیا‘‘۔

یوں تو رجال ورواۃ کے ناقدین کی بڑی تعداد ہے، امام احمد، یحیی بن معین، امام بخاری، ابن ابی حاتم، عقیلی اور دارقطنی وغیرہ کا نام اوران کی کتابوں کا ذکر کرنے کے بعد حضرت محدث الاعظمیؒ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

’’ان ناقدین رجال کے علاوہ علی ابن المدینی، عمرو بن علی فلاس، ابوخیثمہ اوران کے تلامذہ مثلاً ابوزرعہ اورابوحاتم اور مسلم وجوزجانی اوران کے شاگردنسائی، ابن خزیمہ، ترمذی اور دولابی وغیرہ نے بھی رجال ورواۃ حدیث پر کلام کیا ہےاوراس فن میں کتابیں لکھی ہیں‘‘۔

اسماء الرجال کی کچھ اہم تصانیف پر ایک طائرانہ نظر: اس فن پر باقاعدہ تصنیف کا آغاز غالبًا تیسری صدی ہجری کے اوائل میں ہوا، فن رجال پر امام احمد بن حنبل کی ایک اہم تصنیف ’’**كتاب العلل ومعرفة الرجال**‘‘ ہے، یہ چھپ کر اہل علم کے ہاتھوں تک پہنچ چکی ہے۔اس کی پہلی جلد دکتور طلعت قوچ بیکیت اور دکتور اسماعیل جراح اوغلی کے تعلیق وتحشیہ کے ساتھ ۱۹۶۳ء میں انقرہ سے شائع ہوئی، ۵۰۰سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب معرفت رجال کا نہایت قیمتی سرچشمہ ہے۔

امام احمد ہی کے ایک معاصر اورفن حدیث کے زبردست امام علی بن عبداللہ بن جعفر المدینی کی تصنیف ’’**كتاب العلل**‘‘ بھی زیورطبع سے آراستہ ہوکر دنیائے علم وتحقیق میں شائع ہوچکی ہے، اس کا پہلا اڈیشن نامور اسکالر اور محقق ڈاکٹر محمد مصطفیٰ اعظمی کی تحقیق سے ۱۳۹۲ھ = ۱۹۷۲ء میں المکتب الاسلامی- بیروت- سے شائع ہوا۔ڈاکٹر محمد مصطفیٰ اعظمی کے علاوہ عبدالمعطی امین قلعجی نے بھی اس پر تعلیق وتحشیہ کا کام کیا، جس کا پہلا اڈیشن حلب کے دارالوعی سے ۱۴۰۰ھ = ۱۹۸۰ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

امام احمد کی وفات ۲۴۱ھ میں ہوئی، اورعلی بن المدینی کا سال وفات ۲۳۴ھ ہے۔ان حضرات کے معاصر یحییٰ بن مَعین متوفی ۲۲۳ھ ہیں، ان کے کچھ شاگردوں نے بعض راویوں کے متعلق ان کی رائے معلوم کرنی چاہی، اوران کے سامنے اپنے سوالات رکھے، یحیی نے ان کے متعلق جو جوابات دیے، وہ بھی اب مدوّن ومرتّب ہوکر شائع ہوچکے ہیں۔

مذکورہ بالا ائمۂ فن کی تصانیف سے بھی پہلے اس موضوع پر باقاعدہ تصنیف کا سراغ ملتا ہے، حافظ ذہبی کے بیان کے مطابق جلیل القدر محدث اور علم جرح وتعدیل ونقد رجال کے مستند امام یحییٰ بن سعید قطان -متوفی ۱۹۸ھ- نے ''کتاب الضعفاء'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تھی (۱۵)، شیخ یحییٰ قطان امام احمد کے استاذ تھے۔

بلند پایہ مورخ ومحدث ابوعبداللہ محمد بن سعد -متوفی ۲۳۰ھ- نے ''**کتاب الطبقات**'' جیسی عظیم الشان کتاب تصنیف کر کے بے شمار صحابہ وتابعین اور تبع تابعین کے حالات محفوظ کر دیے، جو آج نہ صرف حدیث ورجال حدیث بلکہ اسلامی تاریخ کے ہر طالب علم کے لیے بھی نہایت اہم مرجع اور ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ابن سعد کا شمار اسماء الرجال کے بلند پایہ ناقدین میں ہوتا ہے، یہ کتاب اگرچہ سیر وسوانح یا عام اسلامی تاریخ سے تعلق رکھتی ہے، لیکن اس میں ناقدانہ اقوال بھی بہ کثرت موجود ہیں۔

طبقات ابن سعد کے بعد ابوعبداللہ محمد بن احمد بن عثمان ذہبیؒ -متوفی ۷۴۸ھ- نے ''**تذکرۃ الحفاظ**'' کے نام سے ایک لکھی، ان کا شمار احادیث کے حافظوں میں ہوتا ہے۔

حافظ ذہبی کے بعد ان کی ''**تذکرۃ الحفاظ**''، کا ذیل لکھ کر اس سلسلے کی مزید توسیع اور تکمیل وتتمیم کی کوشش کی گئی، چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی -متوفی ۹۱۱ھ- نے ''طبقات الحفاظ'' کے نام سے اس کا ذیل یا تکملہ لکھا، اور سیوطی سے بھی پہلے ابوالمحاسن محمد بن علی بن حسن بن حمزہ حسینی -متوفی ۷۶۵ھ- اور تقی الدین ابوالفضل محمد بن محمد بن محمد بن فہد مکی -متوفی ۸۷۱ھ- نے ذہبی کی تذکرہ کا ذیل تحریر فرمایا۔

ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری -متوفی ۲۵۶ھ- نہ صرف مذکورہ بالا ائمۂ فن -ابن معین، ابن المدینی اور امام احمد- کے زمرۂ تلامذہ میں ممتاز ہیں، بلکہ آج تک محدثین میں ان کی سی شہرت ومقبولیت کسی اور امام حدیث کو حاصل نہ ہوسکی، وہ کتاب صحیح بخاری کی وجہ سے بارہ صدیاں گزرنے کے باوجود زندہ ہیں۔ امام بخاری کی شہرت کا اصل سبب تو ان کی صحیح بخاری ہے، لیکن انھوں نے صرف یہی ایک کتاب نہیں لکھی، اس کے علاوہ دسیوں کتابیں انھوں نے یادگار چھوڑی ہیں، علم رجال پر جو کتابیں تصنیف کی گئی تھیں، ان سب پر نہایت بیش قیمت اور قابل قدر اضافہ انھوں نے

''التاریخ الکبیر'' لکھ کر کیا، تاریخ کبیر اگر ایک طرف فن رجال پر امام بخاری کے علمی تبحر اور وسیع مطالعہ پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے، تو دوسری طرف تصنیف و تالیف کے میدان میں ان کے بلندیٔ رتبہ کی شہادت پیش کرتی ہے، ان کی یہ کتاب حروف تہجی کی ترتیب سے ہے، لیکن سب سے پہلے انھوں نے ان راویوں کا ذکر کیا ہے، جن کا نام محمد ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس کا آغاز خاتم الانبیاء ﷺ کے نام مبارک سے اور اس نام کی برکت سے ان لوگوں کے تذکرے سے کیا، جن کا نام محمد تھا۔

امام بخاری نے فن رجال میں ''تاریخ کبیر'' کے علاوہ دو اور کتابیں بھی عام رواۃِ حدیث پر تصنیف کیں، جن کا نام ''التاریخ الاوسط'' اور ''التاریخ الصغیر'' ہے۔ ''تاریخ صغیر'' ہمارے ناقص علم کے مطابق پہلی دفعہ مولانا محمد محی الدین جعفری زینبی کے اہتمام سے ۱۳۲۵ھ میں مطبع انوار احمدی - الہ آباد - سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے بہت بعد محمود ابراہیم زاید نے اس کی تحقیق کی اور اس پر حواشی لکھے، جس کا پہلا اڈیشن دو جلدوں میں حلب کے دارالوعی سے ۱۳۹۷ھ = ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔

''تاریخ کبیر'' کی ترتیب امام بخاری نے حروف تہجی پر رکھی ہے، لیکن ''صغیر'' میں راویوں کے حالات میں اختصار کے علاوہ اس کی ترتیب بھی قدرے مختلف رکھی ہے۔ ترتیب زمانی کو ملحوظ رکھا ہے اور سن وار وفات پانے والے رجال کا تذکرہ کیا ہے، مثلاً:

من مات في عهد النبي ﷺ من المهاجرين والأنصار ، من مات في خلافة أبي بكر وعمر ، ذكر من مات في خلافة عثمان ، ذكر من مات في خلافة علي ، ذكر من مات في سنة أربعين الى خمسين ، ذكر من مات في سنة خمسين الى ستين.

اسی طرح ہر دس سال کا عنوان قائم کر کے اس عرصے میں وفات پانے والے رجال و رواۃ کا تذکرہ ہے اور ان میں جو راوی مجروح ہے، اس کے متعلق نپی تلی رائے ہے۔ اس طرح کبیر و صغیر یہ دونوں کتابیں فن اسماء الرجال کا نہایت قیمتی خزینہ ہیں۔

''تاریخ کبیر'' کے بعد کی اور اس سے بہت زیادہ مشابہ اور ملتی جلتی کتاب امام عبدالرحمان

ابن ابی حاتم رازی -متوفی ۳۲۷ھ- کی "**الجرح و التعدیل**" ہے۔ابن ابی حاتم نے اپنی اس کتاب میں بخاری کے اتباع اوران کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے،ابن ابی حاتم نے کسی راوی کے متعلق اقوال نقل کرنے میں کسی قدر بسط اور تفصیل سے کام لیا ہے،اس لیے اس فن کا کوئی عالم و محقق تاریخ بخاری کے باوجود ابن ابی حاتم کی "**الجرح و التعدیل**" سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔''تاریخ کبیر''اور ابن ابی حاتم کی''جرح وتعدیل''سے تیسری صدی ہجری تک کے اکثر راویوں کے ضروری احوال،ان کے اخلاق وکردار،روایت کے باب میں ان کی صحت وسقم،اور ان کے بارے میں علماء جرح وتعدیل اور ائمہ نقد کی رائیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہوگئیں۔ ان کتابوں میں کسی راوی کی زندگی کے ان ہی گوشوں پر خاص طور پر کلام کرنے کی کوشش صرف کی جاتی ہے،جو اسناد اور روایت کی نقد کے سلسلے میں مقصود اور مطلوب ہوتے ہیں۔

ابن ابی حاتم کی کتاب بعد کی تصنیف ہے،اس سے پہلے رجال کی جو کتابیں معرض وجود میں آئیں،اُن میں ابوالحسن احمد بن عبداللہ بن صالح عجلی -متوفی ۲۶۱ھ- کی ایک کتاب "**تاریخ الثقات**" ہے،جیسا کہ اس کے نام ہی سے پتہ چلتا ہے،اس میں صرف اُن راویوں کو جگہ دی گئی ہے، جو ثقہ ہیں،اور جو ناقدین کی کسوٹی پر پورے اتر چکے ہیں،یا کم از کم مصنف کی نگاہ میں ان کا شمار ثقات میں ہوتا ہے۔ڈاکٹر عبدالمعطی قلعجی کی تحقیق وتعلیق سے اس کا پہلا محقَّق اڈیشن ۱۴۰۵ھ=۱۹۸۴ء میں دارالکتب العلمیہ -بیروت- سے شائع ہوا ہے۔

ثقات پر عجلی کی کتاب خاص اس پہلو سے فن کی اولین تصنیف ہے، بعد کے متعدد مصنفین نے صرف ثقہ راویوں کے ذکر کے لیے مستقل کتابیں لکھیں،جن میں محمد بن احمد بن حبان -متوفی ۳۵۴ھ- کا نام اہم ہے،جن کی''کتاب الثقات''شہرۂ آفاق ہے۔اگرچہ ابن حبان نے توثیق کا جو معیار قائم کیا ہے، وہ مختلف فیہ ہے،لیکن اس سے قطع نظر ان کی کتاب ثقہ راویوں کا نہایت قیمتی اور قابل قدر ذخیرہ ہے۔

ابن حبان کے کچھ بعد کا زمانہ ابن شاہین کا ہے،جن کا پورا نام ابوحفص عمر بن احمد بن شاہین -متوفی ۳۸۵ھ- ہے،انھوں نے بھی خاص ثقات پر ایک کتاب **تاریخ أسماء الثقات ممن نقل عنهم العلم** کے نام سے لکھی،اور اس میں بہت سے ایسے راویوں کا تذکرہ

کیا ہے، جن کی ابن معین، ابن المدینی اور امام احمد جیسے ماہرین فن نے توثیق کی ہے، اور ان کی توثیقات کو اپنی سندوں کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ابن شاہین کی ''ثقات'' کی متعدد اہل علم نے خدمت انجام دی ہے، جن میں ایک عراقی عالم شیخ صبحی سامرائی ہیں، جن کی تحقیق سے اس کا پہلا اڈیشن ۱۴۰۴ھ=۱۹۸۴ء میں الدار السلفیہ کویت سے شائع ہوا۔ سامرائی صاحب کے علاوہ اس کی تحقیق مشہور عالم و فاضل قاضی اطہر مبارک پوری نے بھی کی، جو ۱۴۰۶ھ=۱۹۸۶ء میں شرف الدین الکتبی واُولادہ۔بمبئ۔ کی جانب سے شائع ہوئی۔ ان دونوں فاضلوں سے بہت پہلے اس کی تحقیق و تعلیق کی خدمت نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام کے مایۂ ناز عالم و محقق محدث جلیل مولانا حبیب الرحمان الاعظمیؒ نے بھی انجام دی تھی اور اس پر نہایت قیمتی حواشی لکھے تھے، محدث الاعظمیؒ کا کام ان دونوں فاضلوں سے بہت پہلے کا ہے، اور سامرائی صاحب کے نسخے کے منصۂ شہود پر آنے سے تقریباً ۲۶ سال پہلے وہ اس کی تحقیق و تعلیق سے فارغ ہو چکے تھے؛ لیکن موجب افسوس ہے کہ ان کا یہ علمی کارنامہ اب تک طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکا ہے، راقم نے ''حیات ابوالمآثر۔جلد ثانی۔'' میں مطبوعہ دونوں نسخوں اور محدث الاعظمی کے غیر مطبوعہ نسخے کا بہت تفصیل سے مقابلہ و موازنہ کر کے تینوں کے تعلیقات و حواشی اور منہج تحقیق کے فرق کو واضح کیا ہے۔ راقم کی یہ تحریر بعد میں سہ ماہی رسالہ ''المآثر'' کے بیسویں جلد کے چوتھے شمارے میں بھی اشاعت پذیر ہوئی۔ ''ثقات'' کی ایک اور تحقیق عبدالمعطی قلعجی نے بھی کی ہے، جو اس کے تحقیقی اڈیشنوں کے مقابلہ کے وقت راقم کو دستیاب نہیں ہو سکی تھی، اور جب دستیاب ہوئی تو ہماری کتاب پریس میں جا چکی تھی۔

کسی سند کو پرکھنے کا کام اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا، جب تک ان راویوں کی بھی معرفت نہ حاصل ہو، جن کے اندر ضعف ہو، اور جو درجۂ استناد و اعتبار سے ساقط ہوں، اسی لیے جس طرح اہل علم نے ثقہ اور معتبر راویوں پر کتابیں ترتیب دے کر ان کو زندہ جاوید کر دیا، ٹھیک اسی دور میں ضعیف اور مجروح راویوں کو ایک جگہ جمع کرنے کا کام بھی انجام دیا جا رہا تھا اور بہت سے علماء نے ان ضعفاء پر کتابیں لکھیں۔ امام بخاری نے ''کتاب الضعفاء الکبیر'' اور ''کتاب الضعفاء الصغیر'' کے نام سے مجروح راویوں کے تذکرے لکھے، ان کی ''ضعفاء صغیر'' بھی ''تاریخ صغیر''

کے ساتھ انوار احمدی الہ آباد سے مولانا زینبی کے اہتمام سے شائع ہوئی، اور پھر ۱۳۹۶ھ میں محمود ابراہیم زاید کی تحقیق سے اس کا پہلا اڈیشن حلب کے دارالوعی سے اشاعت پذیر ہوا، بعض مراجع سے پتہ چلتا ہے کہ ''ضعفاء صغیر'' انوار احمدی سے بھی پہلے ۱۳۲۳ھ میں آگرہ سے طبع ہوچکی تھی۔

امام نسائی -متوفی ۳۰۳ھ- کی ایک کتاب کا نام ''كتاب الضعفاء والمتروكين'' ہے، اور یہ بھی امام بخاری کی ''ضعفاء صغیر'' کے ساتھ پہلے انوار احمدی الہ آباد سے اور دوبارہ محمود ابراہیم زاید کی تحقیق سے دارالوعی -حلب- سے شائع ہوئی ہے۔

نسائی کے بعد اس دور میں اس فن پر لکھی جانے والی سب سے اہم کتاب ابوجعفر محمد بن عمرو بن موسی بن حماد عُقیلی -متوفی ۳۲۲ھ- کی تالیف ''كتاب الضعفاء الكبير'' ہے۔ یہ کتاب ۴؍جلدوں میں عبدالمعطی امین قلعجی کی تحقیق سے دارالکتب العلمیہ -بیروت- سے ۱۴۰۴ھ = ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی ہے۔

ابن حبان نے جس طرح ثقات پر ایک نہایت مبسوط کتاب تصنیف کی، اسی طرح انھوں نے ضعیف راویوں کی معرفت کے لیے ''معرفة المجروحين من المحدثين'' کے نام سے تین جلدوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی جو مطبعہ عزیزیہ حیدرآباد سے ۱۳۹۰=۱۹۷۰ء میں طبع ہوئی۔

مذکورہ کتابیں ضعیف راویوں کی معرفت کے لیے بہت حد تک کفایت کرتی ہیں، ان کے بعد ابواحمد عبداللہ بن عدی -متوفی ۳۶۵ھ- نے ''الكامل في ضعفاء الرجال'' کے نام سے ضعیف اور مجروح یا متکلّم فیہ راویوں کے حالات بہت تفصیل کے ساتھ قلم بند کیے، انھوں نے نہ صرف راویوں کے تذکرے پر اکتفا کیا، بلکہ ان راویوں کی ان روایتوں کو بھی ذکر کیا، جن کی سندوں میں ان کا نام آتا ہے۔

امام دارقطنی -متوفی ۳۸۵ھ- نے بھی ''كتاب الضعفاء'' کے نام سے خاص ضعیف راویوں پر کتاب تصنیف کی۔ ابن عدی کی کامل کا تکملہ اور ذیل ابوالعباس احمد بن محمد بن مفرج بنانی اشبیلی -متوفی ۶۲۷ھ- نے ''الحافل في تكملة الكامل'' کے نام سے تحریر کیا، بعد ازاں ''کامل'' اور ''حافل'' دونوں کو سامنے رکھ کر امام ذہبی نے ''ميزان الاعتدال في نقد

الرجال''، تصنیف کی، جوضعیف اور مجروح راویوں پرسب سے جامع، معتدل اور بہترین کتاب خیال کی جاتی ہے۔ حافظ ذہبی نے ضعفا و مجروحین پر ''میزان الاعتدال'' کے علاوہ ''المغني في الضعفاء'' لکھی جو ''میزان'' سے پہلے کی تصنیف ہے اور بہت مختصر ہے۔ اور مغنی سے بھی مختصر ان کی ایک اور کتاب ''دیوان الضعفاء والمتروکین'' ہے۔

امام ذہبی کی یہ تینوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں، میزان الاعتدال مطبعۃ السعادۃ -مصر- سے ۱۳۲۵ھ میں تین جلدوں میں شائع ہوئی تھی، اس کا جدید اور محقَّق اڈیشن ۷؍جلدوں میں متعدد محققین کی مشترک تحقیق سے دارالکتب العلمیہ -بیروت- سے ۱۴۱۶ھ = ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا ہے۔ ''مغنی'' شیخ نورالدین عتر کی تحقیق و تعلیق سے ۱۳۹۱ھ = ۱۹۷۱ء میں دارالمعارف - حلب - سے شائع ہوئی، اور ''دیوان الضعفاء'' شیخ حماد بن محمد انصاری کی تحقیق سے ۱۳۸۷ھ = ۱۹۶۷ء میں مکتبۃ النھضۃ الحدیثۃ - مکہ مکرمہ - سے شائع ہوئی۔ افادیت کے اعتبار ''میزان'' ان دونوں کتابوں بلکہ اس فن کی دیگر کتابوں سے بہت فائق ہے۔

''میزان'' کی تلخیص و اختصار اور تتمہ نویسی کا کام حافظ ابن حجر عسقلانی نے ''لسان المیزان'' لکھ کر انجام دیا، اور خاص طور سے ان راویوں کا انتخاب کیا، جن کا تذکرہ ''تھذیب الکمال'' میں موجود نہیں ہے، اور اپنی بالغ نظری سے بہت سے راویوں کا اضافہ کر کے ضعیف راویوں کا بہت بڑا ذخیرہ تیار کر دیا۔ حافظ ابن حجر نے اپنی اس کتاب میں پہلے تو ان راویوں کو چھانٹ کر الگ کر دیا جن کا تذکرہ تہذیب الکمال میں ہے، اور بہت سے ایسے راویوں کا اضافہ کیا جن کا تذکرہ ''میزان'' میں ہونا چاہئے تھا لیکن وہ اس میں مذکور نہیں ہے، اس طرح کے جو اضافے ہیں ان کے نام کے ساتھ ''ز'' کی علامت لکھ کر ان کو میزان کے راویوں سے ممتاز کر دیا، علاوہ بریں ''میزان الاعتدال'' کا ایک ذیل امام ذہبی کے شاگرد حافظ ابوالفضل عبدالرحیم بن الحسین عراقی -متوفی ۸۰۶ھ- نے لکھا تھا، حافظ ابن حجر نے ان کی ذیل سے بھی اکتساب کر کے بہت سے راویوں کا اضافہ کیا، اور ان پر ''ذ'' لکھ کر ان کو نمایاں کر دیا۔ ''لسان'' ۶؍جلدوں میں ۱۳۳۰ھ میں دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہوئی تھی، اس کا جدید اور نہایت شاندار اور خوشنما اڈیشن شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کے اہتمام سے تین ضخیم جلدوں میں دارالبشائر الاسلامیہ - بیروت-

سے ۱۴۲۳ھ = ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا ہے۔

مزی، ذہبی، عراقی اور ابن حجر کی کتابوں کے سوا وہ تمام کتابیں جو اوپر ذکر کی گئی ہیں، سب کی سب تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے عرصے میں معرض تصنیف میں آئی ہیں۔ اگر علم اسماء الرجال کی تاریخ اور اس کے تطور وارتقا کا جائزہ لیا جائے، تو یہی دور اس فن کی تدوین کا دور تھا، جس میں راویان حدیث کی زندگیوں اور ان کے اخلاق وکردار کی روشنی میں ان کے بارے میں اہل علم کی آراء اور ان کے ناقدانہ اقوال سینہ بسینہ منتقل ہوتے ہوئے سفینوں کی امانت بن گئے تھے، اور کتابوں کے اوراق میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے تھے۔ اس جمع وتدوین کا سب سے بڑا اور اہم ترین وحقیقی فائدہ یہ ہوا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی احادیث مبارکہ ہمیشہ کے لیے کسی بھی تصرف اور تلبیس وتدلیس سے مامون ومحفوظ ہوگئیں، تقریباً ہر ہر راوی کو نام بنام مع ولدیت ونسبت کے اس کے کردار کے ساتھ جس طرح ان کتابوں میں درج کیا گیا ہے، اس کے بعد یہ اندیشہ نہیں رہ جاتا کہ احادیث نبویہ میں آمیزش اور ملاوٹ کر کے ان کو بے اعتبار کر دیا جائے۔ اس لیے کہ کسی بھی حدیث کی حقیقت کو جاننے کے لیے سند کی ضرورت ہوگی، اور سند کو دیکھ کر اس کے راوی کے بارے میں ان کتابوں کی مدد سے یہ معلوم کیا جا سکے گا کہ وہ ثقہ ہے یا غیر ثقہ، ضعیف وکمزور ومجروح ہے یا اس میں کچھ قوت ہے اور راوی کا حال معلوم ہو جانے کے بعد اس روایت کے بارے میں کسی نتیجے تک پہنچنا کوئی مشکل امر نہیں رہ جاتا۔

اس دور کے بعد بھی اس فن پر تصنیف وتالیف کا کام ہوا، اور مسلسل اسماء الرجال پر کتابیں لکھی جاتی رہیں، اور کوئی صدی ایسی نہیں گزری جس میں اس فن پر توجہ نہ صرف کی گئی ہو، اور اسلامی فن وثقافت کے ادب میں خاطر خواہ اور معتد بہ اضافہ نہ کیا گیا ہو۔ جب احادیث وآثار کے تقریباً تمام یا محتاط الفاظ میں بیشتر رجال ورواۃ کے جمع وترتیب کا کام بہت حد تک پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا تو آنے والے دور میں اس فن کو مزید متنوع اور ہمہ جہت بنانے کی کوشش کی گئی، اور نئی نئی جہات سے کام کرتے ہوئے اس فن کو زیادہ سے زیادہ وسعت اور ترقی دی گئی، ان ہی مساعیٔ جمیلہ وحمیدہ میں خاص خاص کتابوں کے رجال پر الگ سے اور مستقل طور پر تصانیف وتالیفات ہیں۔

اللہ رب العزت نے صحاح ستہ کو جو شہرت مقبولیت عطا فرمائی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ آج نہ صرف عالم اسلام بلکہ پوری دنیا میں صحاح ستہ کے درس اوران کی سند واجازت لینے کا عام رواج ہے۔

صحاح ستہ کے رجال پر سب سے پہلی کتاب حافظ عبدالغنی بن عبدالواحد مقدسی -متوفی ۶۰۰ھ- کی ''الکمال في أسماء الرجال'' تھی۔اس کتاب کو جو شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی، وہ کم کسی کتاب کے حصے میں آئی ہوگی، بعد کے بہت سے اہل علم نے اس کتاب کی تہذیب وتنقیح، تکمیل واضافہ یا تلخیص واختصار کا کام کیا، اس کا فائدہ یہ ہوا کہ صرف صحاح ستہ کے راویوں کے حالات پر متعدد تصانیف الگ الگ خصوصیات کے ساتھ وجود میں آگئیں۔ ''کمال'' کی طرف سب سے پہلے اپنی توجہ مبذول کرنے والے مشہور حافظ حدیث ابوالحجاج یوسف بن عبدالرحمان المِزّی -متوفی ۷۴۲ھ- ہیں، انھوں نے اضافوں کے ساتھ ''کمال'' کی تہذیب کی، اوراس کا نام ہی ''تهذيب الكمال'' رکھا اور حتی الامکان راویوں کے حالات اوران کے اساتذہ وشیوخ کا استقصا کیا اور ہر راوی کے متعلق دستیاب معلومات جمع کیے، اس میں صحاح ستہ کے رجال کے علاوہ ان راویوں کے حالات بھی قلم بند کیے گئے، جن کی مرویات صحاح ستہ کے مصنفین نے اپنی بعض دوسری کتابوں میں لی ہیں، حروف تہجی کے اعتبار سے ہر راوی کے تذکرے میں یہ علامت رکھی گئی کہ اس کی روایت کس کتاب میں وارد ہوئی ہے، اور راویوں کے حالات میں اپنی سند سے ایسی حدیثیں ذکر کی ہیں، جن کے سلسلۂ سند میں اس راوی کا نام آتا ہے۔ الغرض جس تفصیل کے ساتھ ''تهذيب الكمال'' لکھی گئی ہے، وہ اس وقت متداول یا دستیاب کتابوں میں سے کسی دوسری کتاب میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔

تمام علمی وتحقیقی کمالات کے ساتھ تسامح اور فروگزاشت ہونا، انسانی اور بشری تقاضوں میں سے ہے، اور علم وتحقیق کے میدان میں کوئی کاوش ایسی نظر نہیں آتی جس پر اضافہ یا اس کی تحسین کی گنجائش نہ ہو، چنانچہ ''تہذیب الکمال'' کے بعد حافظ علاء الدین مغلطائی -متوفی ۷۶۲ھ- نے ''اِكمال تهذيب الكمال'' کے نام سے اس کا ذیل اور تکملہ لکھا۔

علامہ مزی کے ایک نہایت ممتاز شاگرد صاحب فضل وکمال حافظ ابوعبداللہ محمد بن احمد

بن عثمان ذہبی -متوفی ۷۴۸ھ- تھے، حافظ ذہبی فن اسماء الرجال کے ایسے جلیل القدر عالم کہ شاذ ونادر ایسا کامل نظر آتا ہے۔ اسماء الرجال کی تصانیف کے ذخیرے میں انھوں نے قابل قدر اضافہ کیا اور اس فن پر متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں "تذهيب التهذيب" بھی ہے، جس کو انھوں نے اپنے استاذ حافظ مزی کی کتاب کو چار چاند لگانے اور اس کو مزید نافع ومفید اور خوب سے خوب تر بنانے کی غرض سے تصنیف کیا تھا۔

"تذهيب" کے علاوہ حافظ ذہبی نے حافظ مزی کی کتاب کا ایک اختصار "الکاشف" کے نام سے بھی کیا، اس میں امام ذہبی نے صرف ان راویوں کو لیا جن کی روایتیں صحاح ستہ میں آئی ہیں، اصحاب صحاح ستہ کی باقی کتابوں کے راویوں کو اس میں شامل نہیں کیا، اور راویوں کے تذکرے میں نہایت اختصار سے کام لیتے ہوئے ان کے حالات بقدر ضرورت تحریر فرمائے اور ان کے بارے میں اہل علم کے ناقدانہ اقوال کے نقل پر اکتفا کیا۔ "کاشف" عزت علی عید عطیہ اور موسی محمد علی الموشی کی تحقیق وتعلیق سے پہلی دفعہ ۱۳۹۲ھ=۱۹۷۲ء میں دار النصر -قاہرہ- سے ۳ر جلدوں میں چھپ کر منصۂ شہود پر آئی، بعد میں مشہور عالم ومحدث شیخ محمد عوامہ نے تحقیق سے بیش قیمت اور مبسوط مقدمہ اور مفید حواشی کے ساتھ ۲ر جلدوں میں ۱۴۱۳ھ= ۱۹۹۲ء میں شائع کیا۔

حافظ ذہبی کے بعد حافظ ابن حجر -متوفی ۸۵۲ھ- نے بھی علامہ مزی کی "تهذيب الكمال" کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا، اور اس کی تلخیص وتہذیب کرتے ہوئے وہ کتاب تصنیف کی جو آج "تهذيب التهذيب" کے نام سے شہرۂ آفاق ہے، اور جس سے حدیث یا اسماء الرجال کا کوئی بھی عالم ومحقق مستغنی اور بے نیاز نہیں ہوسکتا، حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اسماء الرجال پر کتابیں تو بہت لکھی گئیں اور سب ایک سے بڑھ کر ایک اہم اور مفید ہیں، لیکن جو شہرت ومقبولیت "تهذيب التهذيب" کے حصے میں آئی، وہ کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں ہوسکی، کچھ عرصہ پہلے تک راویوں کی تحقیق کا اسی پر انحصار اور دار ومدار تھا، حافظ ابن حجر کی یہ کتاب جن خصوصیات اور محاسن کی حامل ہے، ان کو سمیٹنے یا گفتگو کرنے کی اس عاجلانہ اور مختصر مضمون میں گنجائش نہیں۔

ابن حجر نے اس کتاب سے استفادہ کو مزید آسان بنانے کے لیے "تقريب

التھذیب" کے نام سے اس کا ایک بہت ہی مفید اختصار کیا، جس میں ان راویوں کو جو تہذیب التہذیب کی بارہ جلدوں میں ذکر کیے گئے ہیں، صرف ایک جلد میں سمیٹ کر دریا کو کوزہ میں بند کر دیا۔ یہ کتاب آج سے تقریباً ۱۶۰ سال پہلے مطبع احمدی میرٹھ سے شائع ہوئی تھی، غالباً اس کتاب کی بھی اولین اشاعت کا سہرا اور تمغہ ہندوستان کو حاصل ہے۔ بلاد عرب میں وہ پہلی مرتبہ ۱۳۸۱ھ میں مکتبہ علمیہ مدینہ منورہ سے شیخ عبدالوہاب عبداللطیف کی تحقیق سے اور ۱۴۰۶ھ = ۱۹۸۶ء میں دارالبشائر الاسلامیہ - بیروت - سے شیخ محمد عوامہ کی تحقیق سے شائع ہوئی۔

صحیح ستہ کے رجال ورواۃ پر ان کے علاوہ اور بھی کتابیں تصنیف کی گئیں، لیکن اختصار کے پیش نظر ان کے تذکرے سے اِغماض کیا جارہا ہے۔

صحاح ستہ کے علاوہ جس کتاب کو علم حدیث کی دنیا میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی ہے، وہ حضرت امام احمد بن محمد بن حنبل - متوفی ۲۴۱ھ - کی "مسند" ہے، احادیث نبویہ کا اتنا بڑا ذخیرہ کسی دوسری کتاب میں موجود نہیں ہے۔ اس کی اہمیت وافادیت ہر دور میں مسلّم رہی ہے، اس کے رجال پر بھی مستقل کتابیں تصنیف کی گئیں، اس کے اکثر راوی تو وہ ہیں جن کی روایتیں صحاح ستہ میں بھی آئی ہیں، لیکن ایک بڑی تعداد ایسے راویوں کی ہے، جو صحاح ستہ میں نہیں ہیں، اس لیے ان کا تذکرہ ان کتابوں میں نہیں ہے جو صحاح ستہ کے رجال پر تصنیف کی گئی ہیں، اس کے پیش نظر متعدد اہل علم کو خیال ہوا کہ ایسے راویوں کا بیان بھی یک جا ہونا چاہیے، اس کے لیے حسینی کی "اِکمال" اور حافظ ذہبی کی "تعجيل المنفعة" سامنے آئیں۔

اس کے علاوہ امام طحاوی ابوجعفر احمد بن محمد بن سلامہ - متوفی ۳۲۱ھ - کی "**شرح معانی الآثار**" جو اہل علم میں بہت مقبول ومتداول ہے، اس کے رجال کو بھی مستقل تصنیف کا موضوع بنایا گیا، علامہ بدرالدین عینی - متوفی ۸۵۵ھ - نے "**مغاني الأخيار في شرح أسامي رجال معاني الآثار**" لکھ کر اس کتاب کے تمام راویوں کے حالات قلم بند کرنے کا اہتمام کیا۔

علامہ عینی کے بعد حافظ قاسم بن قُطلو بغا - متوفی ۸۷۹ھ - نے بھی "**شرح معانی الآثار**" کے رجال پر "**الايثار برجال معاني الآثار**" کے نام سے کتاب مرتب کی۔

مولانا ابوتراب رشداللہ شاہ سندی نے "**كشف الأستار عن رجال معاني**

الآثار'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، جو بڑے سائز میں دیو بند سے شائع ہو چکی ہے اور درحقیقت علامہ عینی کی کتاب کا اختصار ہے۔

مولانا حکیم محمد ایوب سہارن پوری نے بھی ''**تراجم الأحبار من رجال معاني الآثار**'' کے نام سے اس کے راویوں کا ایک جامع تذکرہ شائع کیا۔

امام طحاوی کی اور بھی متعدد تصانیف ہیں، خاص طور سے ''**شرح مشکل الآثار**'' تو اپنے موضوع کی بے نظیر کتاب ہے۔ گزشتہ صدی میں امام طحاوی کی ''معانی'' اور ''مشکل'' دونوں کتابوں کے رجال ورواۃ پر مستقل کتاب تصنیف کرنے کا عظیم الشان کارنامہ انجام دے کر حافظ ذہبی وابن حجر کی یاد تازہ کرنے والے مشہور ومعروف اور صاحب بصیرت عالم، اور اسماء الرجال کے بلند پایہ محقق اور ماہر علامہ حبیب الرحمان الاعظمی ہیں، جنھوں نے ''**الحاوي لرجال الطحاوي**'' کے نام سے ''**شرح معاني الآثار**'' اور ''**شرح مشکل الآثار**'' کے اس حصے کے راویوں کے حالات زیب قرطاس کیے جو ۱۳۴۸ھ تک شائع ہوئے تھے۔

جو راویان حدیث کے حالات پر لکھی گئی، ان کتابوں کے علاوہ دیگر ایسی کتابوں میں بھی راویوں کے تذکرے ہیں جو دوسرے عام علوم سے متعلق ہیں جیسے انساب میں سمعانی کی ''انساب''، ابن الاثیر کی ''لباب''، ابن ماکولا کی ''اکمال''، حافظ عبدالغنی بن سعید ازدی وذہبی وابن حجر کی مشتبہ النسبۃ پر تصنیفات، یا علم تاریخ میں ابوالحسن اسلم بن سہل الواسطی معروف بہ بحشل - متوفی ۲۸۸ھ - کی تاریخ واسط، امام حاکم صاحب مستدرک - متوفی ۴۰۵ھ - کی تاریخ نیسابور، احمد بن عبداللہ ابونعیم اصفہانی - متوفی ۴۳۰ھ - کی ذکر اخبار اصبہان، ابوالقاسم حمزہ بن یوسف سہمی - متوفی ۴۲۷ھ - کی تاریخ جرجان، احمد بن علی خطیب بغدادی - متوفی ۴۶۳ھ - کی تاریخ بغداد وغیرہ۔

مذکورہ بالا معروضات سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علماء اسلام، محدثین، ناقدین اور ائمہ فن نے احادیث وآثار کے حاملین اور رواۃ کے حالات کو کس قدر جدوجہد، محنت ومشقت اور جانفشانی وعرق ریزی کے ساتھ کتابوں کے اوراق اور دفاتر میں محفوظ کیا ہے اور ایک ایسی عظیم الشان عمارت تعمیر کر دی ہے، جس کو دوسری قومیں آنکھ بھر کر دیکھنے کی بھی تاب نہیں رکھتیں، اور اس فن سے اپنے پیغمبر ﷺ کی احادیث کو کسی بھی قسم کے دانستہ یا نادانستہ تصرف یا تحریف سے

محفوظ کردیا ہے۔ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ "لسان المیزان" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"جن علوم کا مسلمانوں نے بہت زیادہ اہتمام برتا ان میں رجال حدیث کا علم ہے، اس فن کی انھوں نے تدوین کی اور حیرت انگیز استقصا سے کام لیا، چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی راوی -خواہ ثقہ ہو یا ضعیف- ایسا نہیں ہے جس کا انھوں نے اپنے علم کے مطابق ذکر نہ کیا ہو، انھوں نے نہایت عمدہ اور خوب کام کیا، خود تکلیف اٹھائی اور دوسروں کو فائدہ پہنچایا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعد میں آنے والا دیکھتا ہے کہ اس کی نگاہ سے کوئی راوی ایسا نہیں گزرتا جس کا اس طرح تذکرہ اور ترجمہ نہ کر دیا گیا ہو، جس سے اس کے احوال پوری طرح منکشف ہو جاتے ہیں"۔(۱۶)

محدثین اور ناقدین رجال نے راویوں کے حالات اور عدالت وصداقت کی میزان پر ان کے نقد وتحقیق کا ایسے وسیع پیمانے پر کام نہ کیا ہوتا، تو دوسرے مذاہب کی طرح اسلام کی تعلیم بھی -خدانخواستہ- قصۂ پارینہ بن چکی ہوتی، شیخ نورالدین عتر نے بالکل صحیح لکھا ہے:

ولولا ما بذله الأئمة النقاد في هذا الشأن من الجهود في البحث عن عدالة الرواة واختبار حفظهم وتيقُّظِهم حتى رحلوا في سبيل ذلک، وتكبَّدوا المشاقَّ، ثم قاموا في الناس بالتحذير من الكذابين والضعفاء المُخَلِّطين، لاشُتَبه أمرُ الاسلام، واستولتِ الزنادقة، ولخرج الدجالون(۱۷)

حضرت سفیان ثوری کا یہ قول سنہرے حروف سے لکھنے کے قابل ہے:

الملائكة حُرَّاسُ السَّماء، وأصحابُ الحديث حُرّاسُ الأرض(۱۸)	فرشتے آسمان کے پہریدار ہیں، اور محدثین زمین کے پہریدار ہیں۔

کتب رجال کی نشر واشاعت میں حیدرآباد کا حصہ: علوم اسلامیہ کی بالعموم اور اسماء الرجال کی کتابوں کی بالخصوص نشر واشاعت میں حیدرآباد کا جو حصہ رہا ہے، وہ نا قابل فراموش ہے، شہر حیدرآباد کے شہرۂ آفاق ادارے دائرۃ المعارف نے دیگر اسلامی علوم وفنون کے ساتھ ساتھ فن

رجال کی کتب و مصنّفات کی اشاعت میں جو کردار ادا کیا ہے، اگر اس کو تاریخ فراموش کر دے تو اس کی یہ بہت بڑی ستم ظریفی ہوگی، حقیقت یہ ہے کہ اس ادارے کا دنیائے علم و معرفت اور اہل فضل و کمال پر جو احسان ہے، وہ اس سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ کتنی امہات الکتب اور شاہکار تھے جو طاق نسیاں کی زینت بنے ہوئے تھے، دائرۃ المعارف نے تصحیح و تحشیہ سے ان کو شائع کر کے اہل علم کی روحانی تشنگی کی آسودگی کا سامان فراہم کیا، ورنہ اس سے پہلے ان سے استفادہ تو دور نگاہیں ان کی زیارت کے لیے ترستی تھیں۔ بلاد عرب کے اہل کمال کا مرجع بھی حیدرآباد ہی کی یہی مطبوعات تھیں۔ جی چاہتا ہے کہ اس تحریر کو ختم کرنے سے پہلے ایک اجمالی فہرست ان کتابوں کی پیش کر دی جائے، جو ہندوستان اور خاص طور سے حیدرآباد سے شائع ہوئی ہیں:

۱-**التاریخ الکبیر**: محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ۔ دائرۃ المعارف سے ۱۳۶۱ھ سے ۱۳۷۸ھ کے درمیان وقفہ وقفہ سے شائع ہوتی رہی، اس کتاب کے ۴/اجزاء ہیں، اور ہر جلد دو قسموں پر مشتمل ہے، اس طرح اس کی ۸/جلدیں ہوتی ہیں، اور الگ سے ایک مختصر سی جلد کُنی پر مشتمل ہے۔

۲-**کتاب الکنی والأسماء**: ابوبشر محمد بن احمد بن حماد الدولابی، متوفی ۳۱۰ھ۔ دائرۃ المعارف سے ۱۳۲۲ھ میں شائع ہوئی۔

۳-**کتاب الثقات**: محمد بن احمد بن حبان متوفی ۳۵۴ھ۔ دائرہ نے اس کتاب کو جو ۹/جلدوں پر مشتمل ہے ۱۳۹۳ھ=۱۹۷۳ء سے لے کر ۱۴۰۳ھ=۱۹۸۳ء کے عرصہ میں نہایت اہتمام سے شائع کر کے اہل علم کے ہاتھوں تک پہنچایا۔

۴-**الجمع بین رجال الصحیحین**: ابن القیسرانی متوفی ۵۰۷ھ۔ دو جلدوں میں ۱۳۲۳ھ=۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔

۵-**تذکرۃ الحفاظ**: محمد بن احمد بن عثمان ذہبی متوفی ۷۴۸ھ۔ یہ کتاب ۴/اجزاء پر مشتمل ہے، اور دائرہ نے اس کو ۱۳۳۳ھ و ۱۳۳۴ھ میں طبع کر کے شائع کیا ہے۔

۶-**تہذیب التہذیب**: احمد بن علی بن محمد معروف بہ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ۔ اس کتاب کی اشاعت دائرۃ المعارف کا بہت اہم کارنامہ ہے، جو ۱۳۲۵ھ سے ۱۳۲۷ھ کے

درمیان ۱۲/جلدوں میں شائع ہوکر اہل علم کے لیے باعثِ استفادہ ہوئی۔

۷-**تعجیل المنفعة**: ابن حجر عسقلانی۔۱۳۲۴ھ میں ایک جلد میں شائع ہوئی۔

۸-**لسان المیزان**: ابن حجر عسقلانی۔ یہ کتاب ۶/جلدوں میں ۱۳۳۰ھ میں دائرۃ المعارف سے شائع ہوئی ہے۔

۹-**کتاب المجروحین**: ابن حبان۔ یہ کتاب ۳/جلدوں میں ۱۳۹۰ھ=۱۹۷۰ء میں مطبعہ عزیزیہ حیدرآباد سے طبع ہوکر اہل علم کے ہاتھوں تک پہنچی ہے۔

۱۰-**کتاب التقیید لمعرفة الرواة والسنن والمسانید**: ابوبکر محمد بن عبدالغنی معروف بہ ابن نقطہ متوفی ۶۲۹ھ، دائرۃ المعارف سے ۱۴۰۳=۱۹۸۳ء اور ۱۴۰۴ھ=۱۹۸۴ء میں دوجلدوں میں شائع ہوئی۔

۱۱-**نزهة الالباب فی الألقاب**: ابن حجر عسقلانی۔۱۴۱۵ھ=۱۹۹۴ء میں دائرہ نے اس کو شائع کیا۔

حواشی

(۱) الشیخ عبدالرحمان بن یحییٰ معلّمی: الانوار الکاشفۃ، ص:۳۳۔ (۲) ایضاً، ص: ۹۱۔ (۳) الشیخ عبدالفتاح ابوغدہ: الاسناد من الدین، ص: ۲۹-۳۰۔ (۴) علامہ عبدالحی لکھنوی: الاجوبۃ الفاضلۃ، ص: ۲۵۔ (۵) دکتور محمود الطحان: اصول التخریج ودراسۃ الاسانید، ص ۱۵۸۔ (۶) دکتور احمد محمد نور سیف: عنایۃ المحدثین بتوثیق المرویات واثر ذلک فی تحقیق المخطوطات ص: ۶۔ (۷) الانوار الکاشفۃ، ص: ۹۰۔ (۸) الشیخ عبدالفتاح ابوغدہ: لمحات من تاریخ السنۃ وعلوم الحدیث، ص:۸۳۔ (۹) الاسناد من الدین، ص:۳۱۔ (۱۰) لمحات من تاریخ السنۃ وعلوم الحدیث، ص: ۹۹۔ (۱۱) علامہ حبیب الرحمان الاعظمی: نصرۃ الحدیث، ص: ۲۱۲۔ (۱۲) لمحات من تاریخ السنۃ ......، ص: ۵۳۔ (۱۳) ایضاً، ص: ۵۲۔ (۱۴) نصرۃ الحدیث: ۲۱۳۔ (۱۵) احمد بن محمد بن عثمان الذہبی: سیر اعلام النبلاء، ۹: ۱۸۳۔ (۱۶) مقدمہ لسان المیزان، ص:۴۷۔ (۱۷) دکتور نورالدین عتر: منہج النقد فی علوم الحدیث، ص:۸۴۔ (۱۸) ایضاً، ص: ۴۵۷۔

الحصن المتین فی احوال الوزراء والسلاطین

ایک عربی مخطوطہ

پروفیسر مسعود انور علوی کاکوروی

زیر نظر مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانہ میں محفوظ ہے (۱۲۸۹)۔اس کے مولف عباس مرزا ابن سید احمد حسینی بن سید محمود کاظم ہیں۔ یہ مخطوطہ ۲۱۱ اوراق پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ میں ۱۵ سطریں ہیں، بہ خط نسخ ہے۔عنوانات عموماً سرخ روشنائی سے ہیں۔سنہ کتابت اگر چہ مذکور نہیں ہے مگر قیاس یہ ہے کہ تیرہویں صدی ہجری ہے۔مخطوطہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اب تک میری نظر سے اودھ کی تاریخ وثقافت، امراء وسلاطین اور ارباب حکومت علماء واطباء وماہرین کے حالات وواقعات سے متعلق کوئی مستقل عربی تصنیف کسی معاصر مورخ کی اس کے علاوہ نہیں گذری، فارسی وار دو اور انگریزی میں تو بے شمار کتابیں مطبوعہ ومخطوطہ شکل میں موجود ہیں۔کتب خانہ آصفیہ اور نیشنل آرکائیوز نئی دہلی میں اس مخطوطہ کی نقول ہیں۔

ایشیاٹک سوسائٹی میں موجود نسخہ کی تکمیل ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء میں ہوئی مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں کہیں کہیں معمولی اضافے بھی کیے گئے ہیں۔ضمیمہ کے ذیل میں ایک صفحہ میں ۱۲۸۱ھ کے بعد کے چند مشاہیر کی تاریخ ہائے وفات درج کی گئی ہیں۔

ان میں ملکہ گیتی زوجہ امجد علی شاہ کی وفات چہارشنبہ ۱۲/صفر ۱۲۸۳ھ درج ہے،علاوہ ازیں اعتماد الدولہ ہادی علی خاں، شنبہ ۷/ذوالحجہ ۱۲۸۳ھ،ظفر الدولہ، اقبال الدولہ بن فتح علی کپتان،

شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

نادر مرزا ابن شاہ میر خان وغیرہ کے بعد آخر میں لکھا ہے ''ومنهم ارتحل الی جوار رحمة ربه مولانا المجتهد الامجد الممجد المدعو بالسيد محمد الملقب بسلطان العلماء ليلة الخميس الحادى والعشرين من الشهر الثالث من العام الرابع من العشرة التاسعة من المأة الثالثة من الالف الثانى من الهجرة المقدسة ودفن عند منتصف اليوم المذكور فى حسينية ابيه طاب ثراه وكان عمره خمسا وثمانين سنة''۔

آخری عبارت یہ ہے: وقد حصل لى الفراغ من تسويد هذا الكتاب بعون الملك الوهاب بمنه وكرمه ضحوة يوم الثانى من ذى القعدة ۱۲۸۱ احدى و ثمانين من المأة الثالثة عشر من الهجرة المقدسة و وجدت لتاريخ اتمامه لفظ ''فراغ'' وانا ارجو ممن نظر فيه ان يراه بعين العناية ولا يلحظ سقم العبارة لانى بذلت الجهد البليغ وصرفت الاوقات الكثيرة فى جمعه و تاليفه و تلفيفه وتصنيفه و تعليقه والكربة الغريبة تشتت الاحوال وكمد البال والله حسبى و نعم الوكيل۔

کتاب کے مولف معروف نہیں ہیں۔ راقم احقر کی نظر سے (اس کے محدود مطالعہ اور علم کی بنا پر) اب تک ان کی کوئی دوسری تصنیف نہیں گزری۔ اس نسخہ کے مطالعہ سے ان کے بارہ میں یہ معلومات ملتی ہیں کہ ان کے اجداد نوابین اودھ کے یہاں اعلیٰ مناصب پر فائز تھے، ان کے دادا سید محمود کاظم انجینئر تھے۔ نواب سعادت علی خاں کے عہد (۱۷۹۸-۱۸۱۴ء) میں ان کی زیر نگرانی کئی شاہی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ مولف کے والد غازی الدین حیدر (۱۸۱۴-۱۸۲۷ء) کے معتمد خاص تھے۔ امجد علی شاہ (۱۸۴۲-۱۸۴۷ء) نے مولف کی بڑی عزت وتوقیر کی اور ''سلون'' کا گورنر بنا دیا مگر انجام کار درباری سازشوں اور حاسدوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ انہیں اس عہدہ سے ہٹایا گیا بلکہ ان کا تمام سامان واملاک وغیرہ ضبط کر لیے گئے لیکن بعد میں سو روپیہ مشاہرہ ان کی گذر معاش کے لیے دیا گیا جو آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کے عہد (۱۸۴۷-۱۸۵۶ء) تک ان کو ملتا رہا۔ ۱۲۷۷ھ میں مولف مشہد گئے، نیز حج بیت اللہ

شریف وزیارت حرمین شریفین سے بھی مشرف ہوئے۔

مخطوطہ کی ابتدا اس طرح ہے:

ان احلی ثمرات تشتهی الیها النفوس واسنی کلمات تتزین بها الطروس ۔ الحمد لمن جعل النظام منوطا بآراء السلاطین واحسن نغمات تترنم بها عنادل الاقلام وازین حلی تترشح بها خرائد المرام ۔ النعت لاشرف النبیین محمد شفیع المذنبین صلوات اللّٰه علیه وعلی ابن عمه وخلیفته امیر المومنین امام المشارق والمغارب علی ابن ابی طالب و علی آله الطاهرین المنتجبین واهل بیته الطیبین الی یوم الدین ۔ اما بعد فیقول اقل الخلیقة بل لا شئی فی الحقیقة قصیر الباع وکاسد المتاع الاردستانی اصلا واللکنوی موطنا و منشأ المدعو بعباس میرزا بن السید احمد الحسینی ابا والرضوی اماً انی حصلت فی زمان لیس لی شغل من الاشغال ولا تعلق بشئی من الاعمال فکنت مشوش الخاطر ومضطرب البال فاردت ان اترجم احوال ولاة الاوده من النواب برهان الملک الی اخلافه باجمعهم وفی ضمنهم احوال بعض الحکام الاخر فی العربیة علی طریقة لم ینسج احد علی منوالها وما احدثت قریحة بمثالها ....

مخطوطہ تین ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے، پہلا باب (۳-۱۷۸ ورق ب)۔ اس میں سلاطین اودھ اور امراء وبعض مشاہیر وعلماء کے حالات ہیں۔ دوسرا باب (۱۷۸ ب سے ۱۹۲ الف) نوابین اودھ کی ماؤں کے اسماء ونسب ناموں سے متعلق ہے۔ تیسرے باب (۱۹۲ الف سے ۲۰۳ ب) میں دس فصلیں ہیں۔ ان میں امراء ووزراء اور بعض ملازمین کے حالات ہیں۔ خاتمہ ۲۰۳ ب - ۲۱۱ الف تک دارالسلطنت لکھنؤ کے سلسلہ میں مفید معلومات ہیں۔ اس دور کے شہر کا جائے وقوع، عرض البلاد، طول البلد، عوام کی معاشرت ومعیشت، عادات واطوار اور خصائل مذکور ہیں، لکھنؤ کے چودہ اضلاع گونڈہ، بیسوارہ، بانگر مئو، راٹھ، جگدیش پور، خیرآباد، دیوہ ستر کھ، دریاباد، رام نگر، محمدی، سلطان پور، گشائین گنج، مانک پور اور رسول آباد، صفی پور وسندیلہ کی آبادی،

رقبہ،معیشت اورمحاصل کا تذکرہ ہے۔

لکھنؤ کے بارے میں مولف نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس میں ان کی حب الوطنی کو بھی دخل ہے، لکھتے ہیں کہ یہ شہر اپنی عالی شان عمارتوں، شاندار محلات، وسیع وعریض بارونق بازاروں، پرفضا باغات، نہروں و چشموں، بلند و بالا پرشکوہ میناروں، مساجد، امام باڑوں (حسینیات) مقابر، مندر نیز نواب آصف الدولہ بہادر کے تعمیر فرمودہ، فن تعمیر کے اعلیٰ نمونہ امام باڑہ و جامع مسجد آصفی اور بھول بھلیوں کی وجہ سے پورے ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں اپنی شناخت اورامتیاز رکھتا ہے۔نصیرالدین حیدر کے عہد کی مردم شماری میں یہاں کی آبادی تقریباً دس لاکھ تھی۔۱۸۵۶ء سے قبل تک یہاں بے شمار جامع مسجدیں، حمام، کتب خانے، خانقاہیں، مدارس، اہل صنعت وحرفت، علماء وفضلاء ومشائخ، غیر مسلم پنڈت اور ہر فن میں ایسے صاحبان کمال، موجود تھے جن کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔موسم سرما میں لوگ عجیب عجیب کاری گری سے برف تک جما کر رکھ لیتے تھے جو گرمیوں میں ہر خاص و عام کے کام آتی،لکھنؤ کا شمار چونکہ تیسری اقلیم میں ہے جو کوکب فلک ثالث اورزہرہ سے متعلق ہے اسی لیے یہاں کے باشندوں کے مزاج میں نرم دلی، سادہ لوحی، مروت وسخاوت، وضع داری، خداترسی، کھانے پینے اورلباس میں تکلفات اورصنف نازک کی جانب کسی حد تک میلان جیسے عناصر ہمیشہ سے غالب رہے۔

مولف نے اودھ کے جنگلات، ان میں پائے جانے والے مختلف جانوروں (چرند، درند، پرند) کے عادات وخصائل اور کاشتکاری، پھل، میوہ وغلہ جات، پھولوں وغیرہ کے ضمن میں بھی اپنی معلومات قلم بند کرنے کے بعد کتاب کی کوتاہی داماں کا شکوہ کیا ہے۔

اس اہم کتاب کے مباحث اس طرح ہیں:

۱- الباب الاول فی بیان ولایة صوبة الاودہ وفیه اذکار اولیاء وھو النواب المدعو بالسید محمد امین بن السید محمد نصیر برھان الملک بھادر جنگ (۱۳الف-۹ب)۔

مرزا محمد مقیم ملقب بہ صفدر جنگ،نسب وغیرہ (۱۰ب)۔

امیر تیمور کی وفات (۱۰ب)۔

نواب صفدر جنگ کے اجداد کا نیشا پور میں قیام وغیرہ (۱۱ ب)۔

صفدر جنگ کا اپنے ماموں برہان الملک کے پاس آنا، ان کی بیٹی سے شادی اور نواب شجاع الدولہ کی ولادت (۱۱۲الف)۔

اولاد (۱۱۲الف)۔

روم کی فتح (۱۱۲الف)۔

قزلباش کا تذکرہ (۱۱۴الف)۔

نادرشاہ کی آمد (۱۱۴الف)۔

شہنشاہ ہندوستان کے نام اس کا خط (۱۱۵الف)۔

دہلی کی جانب اس کا خروج (۱۱۸الف)۔

راستہ میں قلندر خاں سے مقابلہ (۱۱۸الف)۔

سلطان اور نادرشاہ کے درمیان ہوئی گفتگو (۲۱الف)۔

دہلی کا معرکۂ عظیم (۱۲۲الف)۔

نواب صفدر جنگ بہادر کا ذکر اور ان کے زمانے کے اہم واقعات (۲۴الف)۔

روہیلوں کا تسلط وغلبہ (۲۸ب)

نواب شجاع الدولہ بہادر اور ان کے عہد کے بعض اہم واقعات (۳۵ب)۔

منشی اعتصام الدین کے اپنے رسالہ میں بیان کردہ بکسر کی جنگ سے متعلق بعض واقعات (۴۱ب)۔

نواب شجاع الدولہ کی اولاد کا تذکرہ (۵۲ب)۔

نواب آصف الدولہ بہادر اور ان کے زمانہ کے بعض واقعات (۵۳الف)

ان کے عہد کی بعض مشہور عمارات (۶۱الف)۔

مرزا خلیل کے احوال وآثار (۶۲الف)۔

علامہ تفضّل حسین خاں کے حالات (۷۲الف)۔

نواب سعادت علی خاں مخاطب بہ یمین الدولہ ناظم الملک مبارز جنگ کی حکومت کا تذکرہ

اوران واقعات کا بیان جونواب وزیر علی کی حکومت، معزولی، وفات ۱۲۰۲ھ نیز محلّہ کاشی باغ باون بستی میں ان کی تدفین وغیرہ سے متعلق تھے (۱۸۱لف)۔

نواب سعادت خاں کے تخت حکومت پر بیٹھنے سے قبل کے بعض واقعات وحادثات (۱۸۲لف)۔

یمین الدولہ نواب سعادت علی خاں کا سریر سلطنت پر متمکن ہونا (۸۵ب)۔

راجہ ٹکیت رائے وزیر نواب آصف الدولہ بہادر کا سنہ وفات ۱۲۱۴ھ۔

ان علاقوں کی تفصیل جو انگریزی حکومت اوراودھ کی سلطنت کے مابین معاہدہ کے بعد (۱۸۰۱ء) انگریزوں کے سپرد کیے گئے (۱۸۷لف)۔

انگریزوں کے اس معاہدہ کی تفصیلات کہ یہ علاقے ہمیشہ نواب اوران کے اخلاف کے رہیں گے۔ انگریز محض ان کی حفاظت اور خارجی وداخلی دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ ومامون رکھنے کی بنا پر ایسا کررہے ہیں تاکہ ان کے محاصل سے وہاں متعین انگریزی فوج کے اخراجات وغیرہ ادا ہوسکیں (۸۷ب)۔

نپولین بوناپارٹ کا قصہ (۸۷ب)۔

ٹیپو سلطان کے حالات (۱۸۸لف)۔

سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں کی ۱۲۱۶ھ میں وفات (۱۸۹لف)۔

وہ عمارات جونواب موصوف کے عہد میں تعمیر ہوئیں (۱۹۰لف)۔

تاج الدین حسین خاں وسبحان علی خاں (۹۰ب)۔

ملاسدّن (۹۱ب)۔

نواب موصوف کے دربار سے وابستہ اطباء وحکماء (۱۹۲لف)۔

نواب موصوف کی اولاد (۱۹۵لف)۔

رفعت الدولہ نواب غازی الدین حیدر کی حکومت اور بعض اہم واقعات (۹۵ب)۔

سید محمد معروف بہ آغا میر بن سید محمد تقی کا ذکر (۹۵ب)۔

۱۸/ذوالحجہ ۱۲۴۳ھ شنبہ کونواب غازی الدین حیدر کا اپنے کوسلطان (بادشاہ) کے لقب سے موسوم کرنا (۹۸ب)۔

بادشاہ موصوف کا تخت سلطنت پر متمکن ہونا (۹۹الف)۔

ان کے عہد کے امراء کے نام (۹۹ب)۔

اس عہد نامہ، قرض کا بیان جو انگریزی حکومت نے بادشاہ سے لیا تھا (۱۰۲الف)۔

تفصیلات اور ارباب مشاہرات کے اسماء (۱۰۳الف)۔

وزارت کی خلعت کا ذکر (۱۰۶ب)۔

علامہ سید دلدار علی غفران مآب لکھنوی نصیر آبادی کی وفات اور ان کی اولاد، اساتذہ و تلامذہ وغیرہ کا ذکر (۱۰۸ب)۔

سلیمان جاہ مرزا نصیر الدین حیدر کی حکومت اور ان کے دور کے بعض اہم واقعات (۱۲۸ب)۔

موصوف کے دور کے علماء کے اسماء (۱۴۱الف)۔

مناجان ملقب بہ فریدون جاہ اور سریر سلطنت پر ان کے بیٹھنے کا قصہ (۱۴۲الف)۔

محمد علی شاہ ملقب بہ نصیر الدولہ کی حکومت اور بعض اہم واقعات (۱۴۳الف)۔

سبحان علی خان کا تذکرہ (۱۴۷ب)۔

انگریزی حکومت اور اودھ کی سلطنت کے درمیان معاہدے (۱۴۸الف)۔

اس دور کے بعض اہم واقعات جیسے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات اور کابل کا تذکرہ (۱۵۴ب)۔

ثریا جاہ سلطان مرزا امجد علی شاہ بہادر کی حکومت، پنجاب کے واقعات، انگریزی حکومت سے معاہدہ وغیرہ کا ذکر (۱۶۳الف)۔

سکندر جاہ نواب میرزا واجد علی شاہ کی حکومت اور بعض واقعات (۱۶۴ب)۔

مولوی امیر علی شہید کا واقعہ (۱۶۸الف)۔

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی (غدر) کے حالات (۱۷۱ب)۔

نواب واجد علی شاہ کے عہد کے علماء و اطباء (۱۷۷الف)۔

علاوہ ازیں اور بھی بہت سے اہم واقعات، اہل سنت کے علماء کے حالات و وفات کے سنین وغیرہ کا ضمناً اندراج ہے۔

۲- الباب الثانی فی ذکر الامهات لولاة ملک الاوده من لدن اشرف النواب برهان الملک الی سلطان واجد علی شاه واسمائهن وبقیة احوالهن (۱۷۸ب)۔

دوسرا باب برہان الملک سعادت خاں سے واجد علی شاہ تک تمام والیان حکومت کی ماؤں کے اسماء اور ان کے تذکرے۔

۳- الباب الثالث فی ذکر اقاربهم بالنسب والمصاهرة (۱۹۲ب)۔

تیسرا باب سلاطین اودھ کے نسبی واز دواجی قرابت دار، یہ دس فصلوں پر مشتمل ہے۔

پہلی فصل: مرزا جعفر بیگ خاں کے اخلاف واعقاب (۱۹۲ب)۔

دوسری فصل: محمد قلی خاں (۱۹۳الف)۔

تیسری فصل: محمد علی خاں بن محمد قلی خاں (۱۹۳ب)۔

چوتھی فصل: دختران محمد قلی خاں (۱۹۵ب)۔

پانچویں فصل: دختران عزت الدولہ (۱۵۶الف)۔

چھٹی فصل: نواب برہان الملک کی اولاد (۱۹۷الف)۔

ساتویں فصل: نواب برہان الملک کے بعض رشتہ دار (۱۹۸الف)۔

آٹھویں فصل: مرزا یوسف، ان کی اور ان کے بھائی کی اولاد (۱۹۹الف)۔

نویں فصل: نواب نجب خاں (۲۰۲ب)۔

دسویں فصل: محمد شفیع خاں بیگ (عم نواب صفدر جنگ) کے اخلاف (۲۰۳ب)۔

الخاتمة فی ذکر دار السلطنة لکهنؤ (۲۰۳ب)۔

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے خاتمہ میں لکھنؤ کے بارے میں مفید معلومات ہیں۔ جس طرح شجاع الدولہ بہادر کے عہد کے فیض آباد کے حالات وکوائف، معاشرت ومعیشت وغیرہ کے سلسلہ میں منشی فیض بخش علوی کاکوروی جو بہو بیگم (اہلیہ نواب شجاع الدولہ بہادر) کے میر منشی تھے، ان کے بیانات، تاریخ فرح بخش (مخطوطہ) میں نہایت اہم ومفید اور مستند ہیں اور اس میں موجود مواد اس طرح کسی دوسری تصنیف میں دستیاب نہیں، اسی طرح زیر نظر مخطوطہ الحصن المتین

فی احوال الوزراء والسلاطین بھی بہت سی حیثیتوں سے بڑا اہم، مستند و مفید ہے۔ معاصر مولفین و تاریخ نویسوں کے اس قسم کے علمی و تاریخی آثار بہت اہم ہوتے ہیں، ان کی حفاظت اور عوام و خواص تک پہنچانا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

قصبہ کاکوری کے ایک اور بزرگ حاجی مسیح الدین خاں علوی بہادر میر منشی گورنر جنرل وسفیر شاہ اودھ (۱۵/شعبان ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء - ۷/محرم ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء) ملکۂ کشور (والدہ واجد علی شاہ) نیز واجد علی شاہ کے بھائی مرزا سکندر حشمت جواد علی اور مرزا حامد علی ولی عہد کے ہمراہ لندن استغاثہ کی خاطر گئے لیکن چونکہ کاتب تقدیر کچھ اور ہی لکھ چکا تھا اس لیے سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔ سفر نامہ لندن (مخطوطہ) بڑے سائز میں ۱۵۳۷ (پندرہ سو سینتیس صفحات) پر مشتمل ہے۔ راقم احقر نے اگر حرف بہ حرف نہ سہی تو بھی بہ غور مطالعہ کیا ہے۔ یہ انگریزوں سے متعلق دلچسپ و مفید معلومات کا خزینہ ہی نہیں بلکہ مولف کی وسعت معلومات، سیاسی بصیرت، حکومت اودھ کی ضبطی، اس کے اہم وجوہ اور بہت سے دوسرے اہم مباحث پر مشتمل ہے۔ مولف نے اپنے اور اپنے خاندان کے کچھ حالات بھی درج کیے ہیں جو ایک عرصہ ہوا خودنوشت مسیح کے نام سے طبع ہو چکے ہیں۔

بہرحال اس قسم کے بہت سے مخطوطات منصۂ شہود پر آنے کے لیے عرصہ سے منتظر ہیں کاش

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ الحصن المتین کے لائق مصنف نے تیسرے باب میں دس فصلوں کے تحت، انساب اور امراء و سلاطین کے اہل خانہ کے سلسلہ میں، ان کے نام اور عرفیت وغیرہ کا اندراج کیا ہے وہ بھی اہم ہے۔ کیونکہ ایک عرصہ تک خواص تو خواص عوام کی خواتین کے نام بھی شرم اور حجاب کی وجہ سے پوشیدہ رکھے جاتے تھے۔

نواب برہان الملک کی والدہ کا نام صدر النساء بیگم۔

نواب صفدر جنگ کی والد (برہان الملک کی ہمشیرہ) کا نام راضیہ بیگم۔

نواب شجاع الدولہ کی والدہ کا نام صدر جہاں بیگم (نواب بیگم)، یہ برہان الملک کی بڑی بیٹی تھیں، ان کی ماں کا نام خدیجہ خانم تھا۔

نواب آصف الدولہ کی والدہ کا نام امۃ الزہراء تھا یہ بہو بیگم کہی جاتی تھیں، بڑی لائق و

بیدار مغز تھیں۔

نواب آصف الدولہ ان کی اکلوتی اولاد تھے۔

نواب سعادت علی خاں کی والدہ ام ولد تھیں ان کا نام ہنس کنور تھا۔

نواب غازی الدین حیدر کی والدہ افضل خانم سے مشہور تھیں۔

نواب نصیر الدین حیدر کی والدہ صبح دولت سے موسوم تھیں جو بادشاہ بیگم سے ملقب ہو کر مشہور ہوئیں۔

نواب منا جان کی والدہ کا نام سکہ چین اور لقب افضل بیگم تھے۔

محمد علی شاہ بادشاہ کی والدہ بھی ام ولد تھیں، ان کا نام سلونی بمعنیٰ ملیحہ یا صبیحہ تھا۔

امجد علی شاہ بادشاہ کی والدہ کھیتو بیگم تھیں جو ملکۂ آفاق کے نام سے ملقب تھیں۔

نواب واجد علی شاہ اختر کی والدہ کا نام مٹھن صاحبہ تھا جو ملکۂ کشور کے نام سے مشہور ہوئیں۔

مؤلف نے ان خواتین کی تاریخہائے وفات، جائے دفن وغیرہ بھی دیے ہیں، ملکۂ کشور کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

ولما انتزعت صوبة الاودھ سارت الی لندن مع ولدھا المسمی بمرزا جواد علی لاستغاثة کما ذکر وتوفیت ھناك یوم الاربعا لتسع لیال خلون من جمادی الاخری سنة اربع وستین بعد المأتین والالف من الھجرة المقدسة وھی بنت خمس و خمسین سنة ودفنت فی بلدة پیرس۔ ثم توفی نجلھا المسمیٰ بمرزا جواد علی ایضاً لیلة الجمعة لعشر لیال خلون من شھرر جب فی السنة المذکورة وھو ابن ثلثین سنة ودفن ھناك .... ۔

کچھ عرصہ پیشتر محترمی ومکرمی پروفیسر سید احتشام احمد ندوی زید لطفہ سے اس مخطوطہ کا ذکر آیا تو انہوں نے از راہ عنایت اس کا ایک نسخہ جو ان کے پاس تھا مرحمت فرمایا، جس کو کبھی محمد سمیع اللہ اسد صاحب نے کلکتہ یونیورسٹی میں پیش کیا تھا، ان کے دست خاص میں ہے مگر نہ کوئی فہرست، نہ کوئی اور تفصیل وتبویب یا دیباچہ ومقدمہ، کاش کہ یہ مرتب ہو کر اصل یا اردو ترجمہ شائع ہوتا تا کہ اودھ کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے عام قارئین اس سے استفادہ کر سکیں۔

اردو شاعری کے فروغ میں
مجددی صوفیہ کا کردار

ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس

شعر انسانی جذبات و احساسات کے اظہار کا ایک عمدہ وسیلہ ہے۔ نثر میں ایسے افکار کو ڈھالنا مشکل ہوتا ہے۔ اقبال کو شاید اسی وجہ سے شہرت شاعر کی حیثیت سے ملی نہ کہ نثر نگار کی حیثیت سے۔ صوفیہ بھی نہایت لطیف جذبات اور خیالات کے مالک ہوتے ہیں وہ قلبی واردات کے لیے شعر ہی کو وسیلہ بناتے ہیں۔ رومی کی شاعری اس کا بین ثبوت ہے۔

اردو زبان میں صوفیانہ فکر کی آمیزش کے اسباب بیان کرتے ہوئے عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے ''اردو شاعری کی ابتداء دکن سے ہوئی جو نہایت قدیم زمانہ سے فقر و تصوف کا مرکز ہے، اسی لیے ابتداء ہی سے اس میں صوفیانہ خیالات کی آمیزش ہوگئی، قطب شاہ کے بعد عالم گیر کے زمانے میں اردو شاعری نے زیادہ ترقی کی تو مستقل طور پر صوفیانہ لٹریچر کی بنیاد قائم ہوگئی''۔(۱)

برصغیر میں نقش بندی مجددی سلسلہ سے وابستہ صوفیہ نے اردو زبان کے شعری ادب کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس سلسلہ میں تصوف سے وابستہ مشائخ و معتقدین نے اردو زبان کے ارتقائی مراحل اور اس زبان کی نشو و نما میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ذیل میں اس سلسلہ سے وابستہ چند افراد کی خدمات کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱- شیخ عبدالاحد (۱۰۵۰-۱۱۲۶ھ/۱۶۴۰-۱۷۱۴ء): حضرت شیخ عبدالاحد وحدت فارسی اور ریختہ (اردو) دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ بارہویں صدی ہجری میں لکھے جانے والے شعراء کے اکثر تذکروں میں ان کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ فارسی میں ان کا تخلص وحدت اور ریختہ (اردو و ہندی)

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامیات، جی سی یونیورسٹی، لاہور۔

میں گل تھا، ان کے والد گرامی نے ان کی خندہ روئی اور شگفتگی رخسار کے باعث کم سنی میں ان کو ''گل'' کہہ کرمخاطب کیا تو عوام وخواص میں اسی عرف سے مشہور ہوگئے (۲)۔مائل دہلوی نے ان کے بارے میں کہا:

استاد شعر ریختہ گزرے ہیں شاہ گل ہر اک کی شاعری کا ملا جن سے سلسلہ
گلشن نے ان سے فیض اٹھایا ہے مدتوں جن کے چراغ سیتی ولی کا دیا جلا
پڑھتا ہوں شال گل کا میں ایک ریختہ وٗلے دے داد اس سخن کی تو اب اس کی عاقلا (۳)

اس کے بعدان کی یہ غزل نقل کی ہے:

ذرا تو سوچ اے غافل کہ کیا دم کا ٹھکانا ہے نکل ہی جب گیا تن سوں تو پھر اپنا بگانا ہے
مسافرتوں ہےاور دنیا سرائے، بھول مت غافل سفر ملک عدم آخر تجھے در پیش آنا ہے
لگانا ہے عبث دولت پہ کیوں دل کوں کہ اب ناحق نہ جاوے سنگ کچھ ہرگز، یہاں سے چھوڑ جانا ہے
نہ بھائی بند ہے کوئی ، نہ یار و آشنا کوئی ٹک اک جوغور سے دیکھوتو مطلب کا زمانہ ہے
لگاؤ یاد میں اس کی نجات اپنی اگر چاہے عبث دنیا کے دھندے میں ہوا گل کیوں دِوانا ہے (۴)

ان اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نقش بندی صوفیہ کی شاعری کی خصوصیات یوں لکھتے ہیں ''اس غزل میں جو مزاج کی سنجیدگی نظر آتی ہے وہ نقش بندیہ سلسلے کے شعراء کی ایک خصوصیت رہی ہے۔ یہاں شعر تفنن طبع کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ فکرواحساس کی سچائی کا اظہار ہے''۔(۵)

۲-حضرت مظہر جان جاناں (۱۱۱۳-۱۱۹۵ھ/۱۷۰۱-۱۷۸۰ء): مرزا مظہر جان جاناں ہندوستان کے ان پانچ عظیم شعراء میں ہیں جنہیں ایران کے مسلم الثبوت اساتذہ کے مقابلے میں پیش کیا جاتا ہے۔ان پانچوں شاعروں کے نام یہ ہیں، امیر خسرو،فیضی، بیدل، مرزا مظہر اور غالب۔(۶)

فارسی کی طرح اردو میں بھی ان کی امامت وسیادت مسلمہ حقیقت ہے۔''انہوں نے اپنے شعری عرفان سے اردو غزل کو جن لسانی ، جمالیاتی ،تہذیبی اور معنوی بنیادوں پر استوار کیا وہ آج بھی اردو غزل میں موجود ہیں۔اسی لیے مرزا مظہر کو''نقاش اول'' کہا گیا ہے۔(۷)

مرزا مظہر جان جاناں نے بہت مختصر کلام یادگار چھوڑا ہے(۸)۔لیکن اس مختصر کلام میں

بھی غزل کی دیومالا کا تانا بانا تیار ملتا ہے۔ان کی غزل میں عشق کی سرشاری اور طرب ناکی کے ساتھ ساتھ مستی کی کیفیات بھی موجود ہیں اور غزل کا مخصوص سوز و گداز بھی......حضور عشق کی صحبتیں بھی ہیں اور عشق و عاشقی کی ثقافت بھی......اور ان سب مضامین کے اظہار کے لیے غزل کا تہذیبی سرمایہ فارسی کی تشبیہیں، استعارے اور علامتیں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ولی کے بعد شمالی ہند کی روایت میں یہ پہلا موقع ہے جب اردو شاعری مکمل طور پر ایک نئے شعری اسلوب میں نمودار ہوتی ہے اور یہی مستقبل کی اردو غزل کا اسلوب بن جاتا ہے:

نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا گئی آخر جلا کر گل کے ہاتھوں آشیاں اپنا
چمن میں کس بھروسے باندھتا ہے آشیاں اپنا نہ گل اپنا کیا میں نے نہ بلبل باغباں اپنا
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے

اس قدر جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا گرچہ الطاف کے قابل یہ دل زار نہ تھا

ہائے کچھ چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار ہم نے کی ہے توبہ اور دھوم مچاتی ہے بہار

مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آباد ہم اتنی فرصت دے کہ رخصت ہولیں اے صیاد ہم

کہاں ہم کو دماغ و دل رہا ہے یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
یہی ایک شہر میں قاتل رہا ہے خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو

مرزا مظہرؔ کے وضع کردہ شعری اسلوب کے بعد اردو کی انفرادی شناخت کا تعین ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جب اردو زبان مقامی لسانی روایت سے بلند اور منفرد ہو کر اپنے انفرادی وجود کا اعلان کرتی ہے اور ادبی تاریخ کے طالب علم کو یہ ہرگز نہ بھولنا چاہیے کہ اس اعلان نامہ کے پیچھے مرزا مظہر جان جاناں کی ادبی شخصیت، جمالیاتی ذوق اور لسانی عرفان برابر موجود رہتا اور یہی مرزا مظہر کی سب سے بڑی ادبی خدمت بھی ہے۔(۹)

سید تبارک علی نقش بندی نے ان کی اصلاحی کوششوں کی درج ذیل فہرست مرتب کی ہے:

۱- ہندی الفاظ پر فارسی الفاظ کو ترجیح دی گئی۔ لہٰذا ولی کے زمانہ کے بہت سے لفظوں اور بندشوں سے زبان پاک کی گئی۔

۲- فارسی الفاظ اور محاورات سے زبان اردو کو مالا مال کیا۔

۳-حسن وعشق کے معاملات نہایت خوبصورتی سے نئے ڈھنگ سے باندھے گئے۔

۴-گل وبلبل، شمع وپروانہ کے پردے میں حقیقی واقعات اردوشاعری میں بیان ہونے لگے۔

۵-صنعت ایہام اورلفاظی کے خارزار سے اردوشاعری کو پاک کیا گیا۔

۶-سریلی اور عمدہ بحروں کا رواج اردوشاعری میں کیا گیا جن کا استعمال اس سے قبل نہ تھا۔

۷-نئی نئی تشبیہوں اور استعاروں اور صنعتوں کا استعمال کیا گیا کہ جس سے زبان کی خوبی میں چار چاند لگ گئے۔

۸-نئی نئی اصناف سخن کا استعمال شروع کیا گیا واسوخت، مرثیہ، مخمس، ہجو، مربع، مستزاد۔

۹-سوقیانہ اور مبتذل خیالات کے اظہار کا دروازہ اردوشاعری میں بند کیا گیا۔(۱۰)

مرزا صاحب کے زیر اثر شاعروں کی ایک ایسی جماعت تیار ہوئی (۱۱) جس نے اردو شاعری کو رفعت خیال اور شائستگی کا شعور بخشا۔یہی وجہ ہے کہ سید تبارک علی نقش بندی نے انہیں فصحائے زمان و بلغائے عصر مصلح اعظم، مجدد شاعری اردو اور دبستان دلی کے امام، جیسے القابات سے نوازا ہے۔(۱۲)

مرزا کے شاگردان الفاظ میں انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

خدیو سخن مرزا جان جان — کہ حکم اس کا ہے ناطقہ پر رواں
لقب اس کا ہے ذوالجلال سخن — کہ بندے میں اس کے سب ارباب فن
سب ارباب فن اس سے ہیں مستفید — کہ علم و ادب اس کے دونوں مرید (۱۳)

تصوف کی چاشنی سے لبریز ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آزاد ہورہا ہوں دوعالم کی قید سین — مینا لگا ہے جب سیتی مجھ بے نوا کے ہاتھ
لوگ کہتے ہیں مر گیا مظہر — فی الحقیقت میں گھر گیا مظہر
بہار آئی کھل آئے باغ بلبل پھول کر بیٹھی — دوانوں کو کہو اس وقت کر لیویں علاج اپنا
الٰہی مت کسو کے پیش رنج و انتظار آوے — ہمارا دیکھیے کیا حال ہو جب تک بہار آوے
تجلی کو گر تری پست و بلند ان کو نہ دکھلاتی — فلک یوں چرخ کیوں کھاتا زمیں کیوں فرش ہوجاتی
اگر ملیے تو خفت ہے وگر دوری قیامت ہے — غرض نازک دماغوں کو محبت سخت آفت ہے

کوئی لیوے دل اپنے کی خبر یا دلبر اپنے کی کسی کا یار جب عاشق کہیں ہو کیا قیامت ہے[۱۴]

۳-انعام اللہ خان یقین (م ۱۱۶۹ھ/۵۶-۱۷۵۵): یہ شیخ عبدالاحد وحدت گل کے پوتے ہیں۔ بقول جالبی ''یقین نے اعلیٰ خاندان میں جنم لیا۔ امارت میں آنکھ کھولی، مرزا مظہر کی تربیت نے ان کے جوہر کو نکھارا، مجدد الف ثانی کے روحانی فیض نے انہیں ابھارا اور شروع ہی سے ایسی شاعری کی جو اس دور کے باطنی تقاضوں کی خوشبو سے لبریز تھی''۔(۱۵)

یقین کی غزل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''یقین کی غزل میں لطافت و شائستگی کے ساتھ ایک شگفتگی و شیرینی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ شاعری وصف و حسن محبوب تک محدود نہیں بلکہ عشق کے تجربات کو بیان کر رہی ہے۔ یقین کی غزل میں فارسی غزل کی طرح اہتمام کے ساتھ بات کو سجا کر بیان کرنے کی کوشش کا پتا چلتا ہے۔ الفاظ احساس و خیال کے ساتھ مربوط و ہم آہنگ ہیں۔ یہاں ایسی بحریں اور زمینیں ملتی ہیں جو نہ صرف منتخب ہیں بلکہ اس سے پہلے اردو میں استعمال نہیں ہوئی۔ زبان میں فارسیت بڑھنے کے باوجود عام بول چال کی زبان سے اس کا گہرا تعلق قائم ہے۔ مثلاً یقین کی یہ غزل دیکھیے:

خدا کی بندگی کہیے اسے یا عشق معشوقی یہ نسبت ایک ہے سو سو طرح تعبیر کرتے ہیں

روداد محبت کی مت پوچھو یقین مجھ سے کچھ خوب نہیں سننا افسوں ہے یہ افسانہ

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے

قیامت آپ پہ اس اس قد سے لا چکے ہم تو کہاں تلک کوئی محشر کا انتظار کرے

گریباں چاک کرنے سے ہمارے تجھ کو کیا ناصح ہمارا ہاتھ جانے اور ہمارا پیرہن جانے

گزر جا وصل سے گر ہجر میں دیکھے رضا اس کی محبت میں یقین لیتا ہے نام مدعا کوئی

یقین کے واقعے کی سن خبر وہ بدگمان بولا یہ دیوانہ تو کچھ ایسا نہ تھا بیمار، کیا کہیے

یقین کے اشعار میں لطف ضرور ہے مگر جب میر درد کے ساتھ آج ان کے کلام کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو کوئی ایسا لطف نہیں ملتا جو ایک خاص نظر اور خاص عالم تخیل کا پتا دے۔ ان کے ہاں تخلیقی آگ اس طرح روشن نہیں ہوتی جس طرح میر کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ ان کے دیوان میں کوئی حسی یا فکری تجربہ ایسا نہیں ملتا جسے یقین کے ساتھ مخصوص کیا جا سکے۔ انہوں نے جو کچھ کیا وہ تاریخ

میں یقیناً بہت اہمیت رکھتا ہے۔ میر نے یقین کے اسی ادھورے پن کو نہ صرف مکمل کر دیا بلکہ اس چشمے کو اپنے دریا میں جذب کر کے اپنا پاٹ بڑا کر لیا۔ اسی لیے میر کے شعر ورد زبان ہو گئے اور یقین کا کوئی شعر زبان پر نہ چڑھ سکا۔ ''دیوان یقین'' میں شاعرانہ لطافت اور فکر کی وہ بالیدگی بھی نظر نہیں آتی جس سے یہ اندازہ و یقین ہو کہ یقین کی شاعری کی اس زمانہ میں سارے عالم میں دھوم مچ گئی تھی البتہ تاریخی تناظر میں دیکھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یقین نئی شاعری کی روایت کے ابراہیم اور میر اس روایت کے آخری پیغمبر ہیں۔ تاریخ ادب میں ان کی یہی اولیت اور یہی اہمیت ہے۔

حق کو یقین کے یاروں بر باد مت دو آخر — تم نے سخن کی طرزیں اس سے اڑائیاں ہیں
مرنے کی طرح میں نے جو یہ اختیار کی — دیکھا تو زندگی میں مزا کچھ رہا نہ تھا
دل میں زاہد کے جو جنت کی ہوا کی ہے ہوس — کوچۂ یار میں کیا سایۂ دیوار نہ تھا
خفیف مجھ سے الجھ کر عبث ہوا واعظ — کہ میں تو مست تھا کیا اس کو بھی شعور نہ تھا (۱۶)

یقین کے اردو شاعری میں لافانی کارناموں کے حوالہ سے ڈاکٹر انور صابر کا یہ تبصرہ بجا طور پر صحیح ہے ''انعام اللہ یقین نے مرزا مظہر کی تحریک پر نئی شاعری کے رجحانات کو اردو غزل میں اس طرح سمو دیا کہ معاصر شعراء کو بھی اپنی تخلیقی کاوشوں کا مستقبل اسی رنگ سخن میں نظر آیا''۔ (۱۷)

۴- میر محمد باقر حزیں وظہور (م ۱۱۶۵ھ/ ۱۷۵۲ء): یہ بھی مظہر جان جاناں کے تلامذہ میں سے اور نئی شاعری کی اسی تحریک کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں زبان و بیان اور جذبہ و احساس کی وہی خصوصیات ملتی ہیں جو ہمیں یقین اور تاباں کے ہاں نظر آتی ہیں۔ لیکن اس میں فرق یہ ہے کہ یقین و تاباں اس رجحان کو آگے بڑھاتے ہیں اور حزیں اس کی تکرار کرتے، پھیلاتے اور عظیم آباد و مرشدآباد میں مقبول بناتے ہیں۔

نہ ہوتا اس قدر خوباں میں گر وہ تندخو نازک — تو کب ہوتی ہماری شاعری کی گفتگو نازک
پاؤں تلک بھی ہائے مجھے دسترس نہیں — بے طرح دیوانگی پر عشق میں آیا ہے دل
دیکھیے اب زندگی کا کیا میرے اسلوب ہو — عاشقوں کے دل میں کب ہے صبر کی طاقت حزیں
نوحہ کرنے میں نہیں ان بے قراروں کا گناہ — میں چاہتا ہوں عشق کو چھپاؤں پہ کیا کروں
کچھ کٹے وصل میں کچھ ہجر میں گریاں گزرے — کیا مری عمر کے اوقات پریشاں گزرے

ان اشعار کی زبان میں اردوئے معلیٰ کا لہجہ رنگ گھول رہا ہے۔ لفظوں کے استعمال میں احتیاط برتی جارہی ہے اور جذبہ واحساس کو شعر کا جامہ پہنایا جارہا ہے جو ردعمل کی تحریک کا اثر ہے۔ یقین کے کلام کی طرح حزیں کے اشعار پڑھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ آبرو کا دور بہت زمانے کی بات ہے۔ حزیں کے زبان و بیان، میر و سودا کے دور میں بھی اپنا رنگ شامل کررہے ہیں۔ بحیثیت مجموعی وہ دوسرے درجے کے شاعر ہیں۔ ان کا رنگ سخن یقین و تاباں سے ملتا جلتا ضرور ہے لیکن وہ نہ یقین سے آگے نکلتے ہیں اور نہ تاباں سے اوپر اٹھتے ہیں۔ وہ اس روایت کی تکرار کرتے ہیں۔(۱۸)

۵-محمد فقیر دردمند (م ۱۱۷۹/۱۷۶۵): محمد فقیر بھی مرزا مظہر کی توجہ سے مجموعۂ کمالات ہوئے۔ دردمند اپنے پیر و مرشد کے بارے میں کہتے ہیں:

زہے پیر و مرشد زہے پیشوا　　کوئی کیا کرے اوس کی مدح و ثنا

دردمند کی اولیت یہ ہے کہ انہوں نے اردو زبان میں پہلا ساقی نامہ لکھا جس کے اشعار کی تعداد باختلاف روایات ۹۱، ۱۲۵، ۱۹۰ تک لکھی گئی ہے۔ مرزا مظہر اسے بہت سنتے تھے۔ وہ ساقی نامہ میں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ سب مرزا مظہر کے فیضان کا نتیجہ ہے۔

کہاں تھا مجھے ریختہ کا خیال　　ہوا جب سے اس امر امتثال

محبت نے مجھ کو کیا لاجواب　　وگر نہ میں اور ریختہ کا حساب

دردمند کے ساقی نامہ پر جمیل جالبی نے نہایت ہی جامع تبصرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''دردمند کا ساقی نامہ اس دور میں مربوط شاعری کا ایک قابل ذکر نمونہ ہے جس میں جذبات و کیفیات نے ایک ایسا رنگ بھرا ہے جو آج بھی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اس ساقی نامے پر فارسی ساقی ناموں کا اثر بہت واضح ہے۔ اگر اس ساقی نامے کا امیر خسرو، جامی، عرفی، ملک قمی اور مولانا ظہوری کے ساقی ناموں سے مقابلہ کیا جائے تو اسلوب و موضوع دونوں پر ان کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔ اس ساقی نامے کی پرکیف دردمندی، بیانیہ انداز میں چھپی ہوئی جذبات و کیفیات کی لہریں، زبان کی صفائی اور بیان کی برجستگی فارسی اثرات ہی سے اردو میں اس طور پر آئی ہے۔ دردمند کے ساقی نامے میں قوت اظہار ایک نئی شان دکھاتی ہے اور اسے بہت آگے لے جاتی ہے جو ادب کی نئی روایت کو توانائی دے کر اس دور کے تخلیقی ذہنوں کو متاثر کرتی ہے۔ غزل کے اس دور میں دردمند کا ''ساقی نامہ'' اسی لیے خاص اہمیت کا حامل ہے۔

یہ نیا رنگ سخن فغاں کے ہاں بھی اپنے انداز میں ابھرا ہے۔(۱۹)

اس آتش سے میرا نہ کر دل کباب نہ کر میری طاقت کے زہرہ کو آب
کہ میں جاں بلب ہوں پیالے کی طرح لگی ہے مجھے آگ لالے کی طرح
ارے مجھ سے کیا جرم واقع ہوا کہ دل تیرا مجھ سے جو یوں پھر گیا
نہ تو مجھ کو دیتا ہے جام شراب نہ فریاد کا میری دیتا جواب
مرے عیش کا دفتر ابتر نہ کر قیامت کو مجھ پر مکرر نہ کر(۲۰)

باقر حزیں اور فقیہ دردمند کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے جمیل جالبی نے لکھا ہے ''دہلی کی شاعری کی وہ روایت جسے ہم نے ''ردعمل کی تحریک'' کے نام سے موسوم کیا ہے، مرزا مظہر کے دو شاگردوں محمد باقر حزیں اور محمد فقیر دردمند کے ذریعے عظیم آباد و بنگالہ پہنچی جہاں ان شعراء نے نئے مذاق سخن کا بیج ڈال کر نئی روایت شاعری کو پروان چڑھایا''۔(۲۱)

۶-خواجہ میر درد(۱۱۳۳-۱۱۹۹ھ): ان کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب (م۱۱۷۲) خواجہ محمد زبیر نقش بندی کے حلقہ ارادت میں داخل تھے۔انہوں نے مسالک تصوف میں ''سلسلہ محمدیہ'' کی بنیاد رکھی، اسی وجہ سے خواجہ میر درد کو اول المحمدین کہا جاتا ہے۔(۲۲)

میر درد نجیب الطرفین سید تھے۔والد کی طرف سے سلسلہ نسب حضرت خواجہ بہاء الدین نقش بند سے اور والدہ کی طرف سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے۔(۲۳)

درد کے صوفیانہ افکار کا تذکرہ گراہم بیلی نے ان الفاظ میں کیا:

> Dard, Mir Dard (1719-1785), one of the four pillars of Urdu, and one of the greatest of Urdu Poets, was a sufi who wrote only religious lyrics and other poems of that type. He never wrote odes, romances of satires, and he avoided all praise of man, for his life was one of the absorption in the duties of religion. (۲۴)

ڈاکٹر ساجد امجد کی رائے کہ درد ہی وہ شاعر تھے جن کے ہاں تصوف اپنی آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ان کے بقول ''یوں تو تصوف اور شاعری کا رشتہ اتنا شدید ہے کہ شاید دنیا کی کوئی

زبان، جو تصوف سے کسی طرح بھی واقف ہے اس نشہ تیز تر سے آزاد نہیں۔ شاعری اور تصوف دونوں کا تعلق جذبات اور تخیل کی پیدا کردہ دنیا سے ہے، اسی لیے تصوف کا بہترین ذریعہ اظہار شاعری ہے لیکن فارسی شاعری اور ایرانی تہذیب میں تصوف کا جتنا عمل دخل ہے اس کی مثال اردو کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتی اور اردو میں بھی صرف اسی لیے کہ فارسی کی پیروی کی گئی اور ایران و ہند کے سماجی و سیاسی حالات ہم آہنگ رہے۔ اسی لیے اردو شاعری ابتدا سے اب تک کسی دور میں بھی تصوف سے خالی نہیں رہی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ "تصوف" بیشتر ایک رسمی مضمون اور زمانے کے فیشن کے اعتبار سے اختیار کیا گیا، فارسی کی طرح اردو کو ایسے صوفیہ میسر نہیں آئے جو اصلاً شاعر ہوں۔

اردو شعراء کی طویل فہرست میں خواجہ میر درد ایسے شاعر ضرور ہیں جنہیں محض صوفی کہتے ہوئے دل دکھتا ہے۔ ان کے ذہن میں شاعری کا خانہ بڑا تھا یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے نگار خانہ شاعری کو تصوف کی مروجہ تصویروں سے مزین کیا۔ اس طرح انہوں نے نہ صرف اپنی ذاتی زندگی کو شاعری میں منتقل کیا بلکہ اس عہد کے فکری نظام کو بھی زندگی بخشی۔ (۲۵)

عبدالسلام ندوی نے تو یہ لکھا کہ خواجہ میر درد نے سب سے پہلے اردو زبان کو صوفیانہ خیالات سے آشنا کیا۔ (۲۶)

خلیل الرحمٰن داؤدی کے بقول "درد کی شاعری ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہے اور ان کی شخصیت پر ان کی جدید روایت، خانگی ماحول، بزرگوں کے افکار و آراء اور اس عہد کے سیاسی حالات اثر انداز ہوئے ہیں۔ درد کا کلام محض تفریح مزاج یا تفنن طبع کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ انہوں نے اپنے مخصوص مسالک تصوف، اسرار معرفت، زندگی و موت اور دنیا و آخرت کے بارے میں اپنے نظریات سے ہمیں آگاہی بہم پہنچائی ہے (۲۷)۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

اگر جمعیت دل ہے تجھے منظور، قانع ہو ۔۔۔ کہ اہل حرص کے کب کام خاطر خواہ ہوتے ہیں (۲۸)

سمجھنا فہم گر کچھ ہے طبیعی سے الٰہی کو ۔۔۔ شہادت غیب کی خاطر تو حاضر ہے گواہی کو (۲۹)

نہ مطلب ہے گدائی سے، نہ یہ خواہش کی شاہی ہو ۔۔۔ الٰہی ہو وہی جو کچھ کہ مرضیٔ الٰہی ہو (۳۰)

سطور بالا سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فکر و عمل کی تطہیر کے جس کام کا آغاز اکبر کے عہد حکومت میں کیا تھا وہ کثیر الجہتی تھا۔ سیاسی، مذہبی اور معاشرتی نقطۂ نظر

سے تو عموماً بحث کی جاتی ہے لیکن اردو شاعری کی نشو ونما اور اسے مقصدیت و معنویت سے آشنا کرنے کے پیچھے بھی مجددی تطہیر کا ہاتھ نظر آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اردو زبان کے محققین شیخ عبدالاحد اور مظہر جان جاناں شہید کو خراج عقیدت پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

حواشی

(۱) عبدالسلام ندوی، مولانا، شعر الہند، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء، ص ۲۲۰۔ (۲) اقبال مجددی، محمد، مقدمہ لطائف المدینہ، حوزہ نقش بندیہ لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۴۰۔ (۳) اکرم چغتائی، محمد، مائل دہلوی کا ایک تاریخی قطعہ در سہ ماہی فنون، ج ۴، ش ۲، دسمبر ۱۹۱۶ء، ص ۲۴۱۔ (۴) ایضاً ص ۲۴۲۔ (۵) جمیل احمد، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۷ء، ج ۲، ص ۱۲۳۔ (۶) تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۲۷۹۔ (۷) ایضاً، ص ۲۷۸۔ (۸) اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سید تبارک نقش بندی نے لکھا ہے "یہ ہماری اپنی اور اردو شاعری و ادب اردو کی بدقسمتی ہے کہ ان کا پورا پورا اردو کلام محفوظ و مدون نہ ہو سکا اسی باعث ان کا اردو کلام کم دستیاب ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ آپ کا اردو کلام بھی فارسی کلام کی طرح سے کسی نے پہلے ہی آپ کی حیات میں مدون کیا ہوتا لیکن ایسا نہ ہو سکا اور انہوں نے اپنی فارسی شاعری کے متعلق ہی اپنے فارسی کے دیوان کے عنوان میں فرما دیا ہے کہ والاہمتی کی وجہ سے "اجزائے مسودات و مواد کلیات اکٹھا نہ کیا بہت سا سرمایہ سخن برباد ہو گیا"۔ حضرت والا کی اس بات سے یہاں یہ بات واضح ہے کہ انہوں نے اپنے کلام کی تدوین کا خیال اپنی والاہمتی کے باعث نہ کیا اور بہت سرمایہ سخن برباد ہو گیا۔ درحقیقت حضرت کا یہ فرمان چونکہ فارسی دیوان کے عنوان میں ہے اس لیے واضح ہے کہ یہ خیالات فارسی شاعری کے لیے فرمائے ہیں۔ لیکن غور کا مقام تو یہ ہے کہ کیا حضرت کی والاہمتی فارسی شاعری تک ہی محدود تھی اور جب اس زمانہ میں فارسی کا زور وقدر و اقتدار ہوتے ہوئے فارسی کلام کی تدوین کا اہتمام نہیں کیا تو پھر بھلا اردو شاعری ہی کا کیا اہتمام فرماتے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ بہت سا سرمایہ سخن برباد ہو گیا یعنی فارسی کا تو جب فارسی جیسی شاعری کا سرمایہ برباد ہوا تو کیا اردو کا سرمایہ سخن برباد نہ ہوا ہوگا۔ یقیناً برباد ہوا ہوگا۔ ان کے اردو کلام کے اس وقت کم پائے جانے کی وجوہات میں خیال کرتا ہوں یہی ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اور حضرات کو اور بھی دیگر وجوہات مل جائیں۔ جب آپ کے شاگردان شاعری اردو تک صاحب دیوان ہوئے تو یقیناً آپ کا اردو کلام اور بھی زیادہ ہونا چاہیے۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا بھی ہے کہ ان کا اردو شاعری کا دیوان بھی مرتب ہو گیا تھا۔ گارسان دتاسی نے بھی ان کے دیوان ہندوستانی کا تذکرہ کیا ہے۔ شاہ شاہد علی سبز پوش تخلص رئیس گورکھپور کا بیان ہے کہ مرزا صاحب کا مکمل دیوان اردو قلمی کتب خانہ خانقاہ جونپور میں موجود ہے۔ پتہ لگا ہے کہ

جونپور کی خانقاہ کے کتب خانہ میں اب دیوان مذکور موجود نہیں ہے۔ خدا جانے کہاں پہنچا۔ ایسی چیز کسی کے ہاتھ پڑ گئی اور اس نے اب انہیں ظاہر کرنا مناسب نہ خیال کیا ہو۔ (تبارک علی نقش بندی، سید، مرزا مظہر جان جاناں ان کا عہد اور اردو شاعری، اردو اکادمی دلی، ۱۹۸۸، ص ۱۷۰-۱۷۱)۔ (۹) ایضاً، ص ۲۸۰-۲۸۱۔ (۱۰) مرزا مظہر جان جاناں، ان کا عہد اور اردو شاعری، ص ۸۲۔ (۱۱) ان کے فیض یافتہ افراد کا تعلق صرف نقش بندی سلسلہ تک محدود نہیں بلکہ دیگر سلاسل میں ارادت رکھنے والے بھی مستفید ہوئے۔ مظہر جان جاناں کے شاگردوں میں احسن اللہ خاں بیان بھی ہیں، انہوں نے روحانی تربیت شاہ فخر الدین دہلوی سے حاصل کی۔ (چشتی سلسلہ کے معروف بزرگ، سرسید احمد خاں، آثار الصنادید، مرتب خلیق انجم، اردو اکادمی دلی ۱۹۹۰، ص ۲۶-۲۸)، مرزا صاحب کے بارے میں احسن اللہ خاں بیان کا کہنا ہے:

مظہر ہے خداوند کی وہ شانِ اتم کا　　بندے سے ثنا حضرت استاد کی کیا ہو

(ارجمند آراء (مرتب)، دیوان بیان، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی ۲۰۰۴، ص ۷۹، غزل: ۱)

جب سے شاگرد ہوا حضرت مظہر کا بیاں　　کیا شاگردی کا اقرار سب استادوں نے

(ایضاً، ص ۱۳۹، غزل: ۱۵۱)

مظہر کی بندگی میں ہے اب بیان بھی حاضر　　وہ خوب جانتا ہے جیسے ہیں آپ شاعر

یہ اپنے حق میں صاحب کرتے عبث ہیں ظاہر　　حق کو یقین کے یارو برباد مت دو آخر

تم نے سخن کی طرزیں اس سے اڑائی ہیں　　(ایضاً، ص ۱۵۴، مخمس بر ریختہ انعام اللہ خاں یقین)

(۱۲) مرزا مظہر جان جاناں، ان کا عہد اور اردو شاعری، ص ۱۸۱۔ (۱۳) ایضاً، ص ۱۷۳۔ (۱۴) ایضاً، ص ۱۸۰۔ (۱۵) تاریخ ادب اردو، ج ۲، ص ۳۷۷-۳۷۸۔ (۱۶) ایضاً، ص ۳۷۹-۳۸۱۔ (۱۷) انور صابر، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو غزل کا ارتقاء، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۲۰۰۲، ص ۶۱۔ (۱۸) تاریخ ادب اردو، ج ۲، ص ۳۹۰-۳۹۱۔ (۱۹) ایضاً، ص ۳۹۸۔ (۲۰) ایضاً، ص ۳۹۶۔ (۲۱) ایضاً، ص ۹۲۰۔ (۲۲) داؤدی، خلیل الرحمٰن (مرتب)، دیوان درد، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۸، ص ۳۲۔ (۲۳) ایضاً، ص ۱۷۔ (۲۴) یزدانی، ڈاکٹر خواجہ حمید، خواجہ میر درد کی فارسی شاعری، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۳، ص ۵۲۔ (۲۵) ساجد امجد، ڈاکٹر، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، الوقار پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۳، ص ۲۷۹۔ (۲۶) شعر الہند، ص ۲۲۰۔ (۲۷) ساجد امجد، ڈاکٹر، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، الوقار پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۳، ص ۱۱۱-۱۱۲۔ (۲۸) ایضاً، ص ۱۶۳۔ (۲۹) ایضاً، ص ۱۸۵۔ (۳۰) ایضاً، ص ۱۸۷۔

اردو کے چند اہم ادبی جرائد کے اولین شمارے

ڈاکٹر اسد فیض

بیسویں صدی کی ابتدائی دھائیوں میں برصغیر کے اہم ادبی مراکز سے ادبی جرائد کی اشاعت کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ ان ادبی جرائد نے برصغیر کے ادبی معاشرہ کی علمی اور فکری بنیادیں استوار کیں اور ان کو استحکام بخشا۔ اپنے عہد کا شعور سمیٹے ہوئے یہ ادبی رسائل ہمارا عظیم اثاثہ ہیں۔ آج کے کئی معروف ادیبوں کی ابتدائی تحریروں اور علمی و فکری تحریکوں کے بھی یہ جرائد امین ہیں۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے اپنے ایک مضمون ''اردو کا اولین رسالہ'' میں ''محبّ ہند'' دہلی کو اردو زبان کا اولین ادبی جریدہ قرار دیا ہے۔ اس کا اجرا جون ۱۸۴۷ء میں عمل میں آیا (۱)۔ یہ ہر ماہ دہلی سے چھوٹی تقطیع کے پچاس صفحات کی ضخامت میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر ماسٹر رام چندر (۱۸۲۱-۱۸۸۰) تھے جو دہلی کالج میں علوم ریاضی کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے کئی کتب تالیف کیں۔ ان میں چند اردو زبان میں بھی تھیں۔ رسالہ ''محبّ ہند'' میں بہادر شاہ ظفر، شاہ نصیر کی غزلیں اور مومن و مجنوں کی شاعری بھی شائع ہوتی رہی۔ یوسف خاں کمبل پوش کا سفرنامہ کئی شماروں میں قسط وار طبع ہوا۔ اکتوبر ۱۸۴۹ء کے شمارے میں یوسف خاں کمبل پوش کی شبیہ بھی شائع کی گئی۔ رسالہ محبّ ہند سے اب تک ادبی جرائد کی اشاعت کو ایک سو باسٹھ برس کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اس دوران جن رسائل نے اپنی منفرد اشاعتوں سے ادبی تاریخ پر یادگار نقوش ثبت کیے۔ ان میں ایک اہم نام نیاز فتح پوری کے ادبی جریدہ ''نگار'' کا ہے۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی کی ابتدا میں اس ادبی جریدہ نے ہندوستان میں ایک دبستان اور تحریک کی صورت اختیار کر لی تھی اور اس کے موضوعات اور اسلوب ادب کی رومانوی تحریک کی تقویت کا باعث بنے۔

ایسوسی ایٹ پروفیسر، اسلام آباد ماڈل کالج فار بوائز، سیکٹر F-10/3، اسلام آباد (پاکستان)۔

نگار کا پہلا شمارہ فروری ۱۹۲۲ء میں آگرہ سے شائع ہوا (۲)۔ اولین شمارہ کے سرورق پر رئیس التحریر کے عنوان سے نیاز فتح پوری کا نام درج ہے، جبکہ اندرونی صفحات سے پتہ چلتا ہے کہ مخمور اکبر آبادی بھی ان کے ساتھ معاون مدیر کے طور پر شامل تھے۔ نیاز فتح پوری (۱۸۸۴ - ۱۹۶۶) تاریخ ساز ادبی شخصیت تھے۔ انہوں نے اپنے عہد کے ادبی، مذہبی اور تہذیبی منظر نامے پر انمٹ نقوش ثبت کیے۔ نگار بنت عثمان ترکی کی ایک انقلابی شاعرہ تھی۔ نیاز اس کی انقلابی اور رومانوی شاعری سے متاثر تھے۔ اس لیے انہوں نے اس کے نام پر نگار کا اجرا کیا۔ نیاز فتح پوری اس وقت تک افسانہ نگار کے طور پر شہرت حاصل کر چکے تھے لیکن نگار ان کے سنجیدہ علمی موضوعات کا صحیح معنوں میں ترجمان ثابت ہوا۔ نگار میں انہوں نے اخلاق وحکمت سے لے کر علم نجوم، مذہب، ادب، سیاست، معاشرت اور جنس تک کے موضوعات پر خامہ فرسائی کی۔ پہلے شمارے کے کل صفحات اَسّی ہیں۔ پرچہ کی ابتدا منظوم انتساب کی صورت ہے۔ جو نیاز فتح پوری کے اعلا شعری ذوق اور اختراعی ذہن کی علامت ہے۔ اس تخیلاتی اور احساس آفریں نظم کا آخری شعر ہے۔

ان خندہ ہائے حسن کی کرتا ہوں قائم یادگار یعنی ان پھولوں کا ہے چھوٹا سا گلدستہ نگار

''عناصر نگار'' کے عنوان سے نیاز نے اداریہ لکھا ہے اور ''نگار'' کی اشاعت اور اس کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی ہے۔ نثری مضامین میں پہلا مضمون شعر (عربوں کے نقطہ نظر سے) ہے یہ نیاز فتح پوری کا لکھا ہوا ہے۔ جس میں شاعری اور شعر کی داستان کو رقم کیا گیا ہے۔ اس میں دیگر اقوام اور زبانوں میں بھی شاعری کے معانی اور ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ نیاز تحقیقی مزاج بھی رکھتے تھے۔ فکشن کی ذیل میں ''سمنتسان کی شاہزادی'' کے عنوان سے لطیف الدین احمد کا ایک افسانہ شائع ہوا ہے۔ ل احمد کا اسلوب سجاد حیدر یلدرم کے رنگ سے مماثلت رکھتا ہے، کہانی دلچسپ اور قدیم شہزادے شہزادیوں کے قصے پر مبنی ہے۔ اگلے صفحات پر نیاز فتح پوری کا ایک مضمون ''کیا مانی واقعی مصور تھا'' طبع ہوا ہے جس میں مانی کی اصلیت کے بارے میں تحقیق کی گئی ہے اور اس کے مذہب کے بارے میں معلومات پیش کی گئی ہیں۔ ''صحرا کے موتی'' کے نام سے قمر الحسن کی ایک کہانی اس شمارے کی زینت ہے۔ یہ عرب معاشرت سے متعلق ہے اور ایک لڑکی کی بے مثال قربانی سے عبارت ہے۔ ترکی ادب سے ماخوذ

''گیسو'' کے عنوان سے نیاز اور ''مطربہ'' کے نام سے امتیاز علی تاج کے رشحات قلم برصغیر میں ترکی ادب کی مقبولیت اور نثر کے رومانوی اسلوب کے مرصع ورنگین انداز کی خوبصورت جھلکیاں ہیں۔ نیاز فتح پوری کے دیگر مضامین میں ''جرمن حرب وتجارت کا ایک عجیب راز''، معلومات حرکت زمین کا مشاہدہ عینی، اشتراکیت کے عنوان سے معلوماتی۔صفحہ ۵۵ پر ایک غلطی کا ازالہ کے عنوان سے نیاز نے علی گڑھ میگزین کی جولائی تا اکتوبر اشاعت میں سُہا کی شرح دیوان غالب پر ایک معاندانہ تبصرہ سے اپنی لاتعلقی کا اعلان کیا ہے۔مضمون کے آخر میں صرف فتح پوری از بھوپال شائع ہوا ہے۔انہوں نے ایڈیٹر رشید احمد صدیقی سے نگار کے صفحات کے توسط سے استدعا کی ہے کہ اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں۔نگار کے اس شمارے میں چھپنے والی منظومات بھی معیاری ہیں۔ ''فروغ نظر'' کے عنوان سے ضیائی، ''شام چمن'' کے نام سے مخمور اکبرآبادی جن کا اصل نام سید محمود رضوی ہے ان کی ایک نظم ''اندر پرستش'' کے عنوان سے صفحہ ۳۹-۴۰ پر ایک فارسی نظم، ''بہار کی دیوی'' کے عنوان سے نیاز فتح پوری کی نظم اس شمارہ کا قابل قدر حصہ ہیں۔اس شمارے کی واحد غزل شوکت علی فانی کی تحریر کردہ ہے جس پر ایڈیٹر نے ایک طویل نوٹ لکھا ہے۔مجموعی طور پر نگار کا یہ شمارہ اس دور کے ادبی مزاج کو سمجھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔خاص طور پر اس شمارے کی وساطت سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ نیاز اپنے عہد کی نابغہ روزگار شخصیت تھے جنہوں نے ادب میں اپنی الگ پہچان بنائی۔اگست ۱۹۶۲ء سے نگار پاکستان کے نام سے کراچی سے تسلسل کے ساتھ شائع ہورہا ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس کے ایڈیٹر اور پبلشر ہیں۔نگار کا شمار آج بھی سنجیدہ ادبی جرائد میں ہوتا ہے۔جس پر ابتداء میں نیاز کی اور بعد میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی شخصیت کی چھاپ نمایاں ہے۔اس کا ہر شمارہ یادگار حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔

بیسویں صدی کی دوسری دھائی میں ایک اور ادبی جریدے نے بھی مجلّاتی صحافت کو نئی راہوں اور مزاج سے آشنا کیا۔اس کا نام ''نیرنگ خیال'' ہے۔نیرنگ خیال کے مالک ومدیر حکیم یوسف حسن تھے۔وہ افسانہ نویس اور طبیب بھی تھے۔وہ ۱۸۹۴ کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم لاہور میں پائی۔مڈل پاس کرنے کے بعد ریلوے میں بطور گڈس کلرک ملازم ہوگئے تھے۔ لائل پور میں بھی تعینات رہے۔انہوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا افسانہ نگاری سے کی۔ان کے

افسانے ''نیرنگ خیال'' اور ''زمانہ'' کانپور میں شائع ہوتے رہے۔ جو اس زمانے کا ایک مقبول ادبی جریدہ تھا۔ حکیم یوسف حسن نے نیرنگ خیال کا اجراء جولائی ۱۹۲۴ میں لاہور سے کیا (۳) ان کے ساتھ محمد دین تاثیر (۱۹۰۲-۱۹۵۰) بھی جوائنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے شریک سفر تھے۔ حکیم یوسف حسن کا کہنا ہے کہ نیرنگ خیال کا نام حکیم فقیر محمد چشتی نے تجویز کیا تھا اور اس کا ٹائٹل بھی حکیم فقیر محمد چشتی نے بنایا تھا (۴)، پہلے شمارے کا سائز ۲۳×۳۳/۸ اور اس کے کل صفحات پچاس تھے۔ علامہ اقبال نے ''نیرنگ خیال'' کی اشاعت پر اس کے ایڈیٹر کو ایک خط ۱۷/اگست ۱۹۲۴ کو تحریر کیا:

> ''رسالہ نیرنگ خیال جو حال ہی میں لاہور سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ بہت ہونہار معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مضامین میں پختگی اور متانت پائی جاتی ہے مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ پنجاب میں صحیح ادبی مذاق پیدا کرنے میں بہت مفید ثابت ہوگا''۔ (۵)

پہلے شمارے کا اداریہ ''مقالہ افتتاحیہ'' کے عنوان سے حکیم یوسف حسن نے تحریر کیا ہے۔ انہوں نے اداریہ میں لکھا ہم اسے تجارتی فوائد کے لیے نہیں چلا رہے مگر ہم تمام تجارتی اصولوں کے پابند رہیں گے تاکہ اس رسالہ کی زندگی محض ایک رقص شرر ثابت نہ ہو۔ ان کا یہ خلوص شائد قدرت کو اتنا پسند آیا کہ اس پرچے نے خاص نمبروں کی اشاعت کا رواج ڈالا اور علامہ اقبال کی زندگی ہی میں ان پر ایک شاندار اور یادگار نمبر ستمبر-اکتوبر ۱۹۳۲ میں شائع کیا۔ حکیم یوسف حسن کا انتقال ۱۹۸۱ کو راولپنڈی میں ہوا۔ ان کی عمر نوے برس تھی (۶)، حکیم یوسف حسن کا یہ فیضان ''نیرنگ خیال'' جس نے اپنا اشاعتی سفر ۱۹۲۴ میں شروع کیا تھا۔ آج بھی جاری وساری ہے۔ اب سلطان رشک اسے راولپنڈی سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ پہلے شمارہ کے مشمولات میں مضامین کا حصہ بے حد معیاری اور معلوماتی ہے۔ ابتدائی صفحات میں ''شذرات'' کے عنوان سے ہندوستان بھر سے اہم خبروں اور واقعات کو بھی شائع کیا گیا ہے۔ ان شذرات سے اس دور کے سیاسی ومعاشرتی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ تحریک خلافت کے حوالے سے تحریر ہے:

> ''سیاسی سرگرمیوں اور مسئلہ خلافت کے حل میں مسلمانوں کے کامل

دس سال صرف ہو چکے لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ مسئلہ خلافت ہنوز روز اول کا مصداق ہے اور بلاشبہ اس کی ضرورت سمجھنے یا اس کے متعلق حقیقی کام کرنے کا وقت اب آیا ہے۔ گذشتہ دس سال کی سیاسی سرگرمیوں سے ہمیں کوئی نمایاں فائدہ نہیں پہنچا، کیونکہ ان سرگرمیوں کا انجام ہندو مسلم نفاق کی صورت میں ظاہر ہوا ہے اور تمام ملک میں کانگریس کمیٹیوں کی جگہ سنگھٹن شدھی اور مہابیر دَل وغیرہ جماعتوں نے لے لی ہے۔ قومی اخبارات کی جگہ ہندو مسلمانوں کو لڑانے اور گالیاں دینے کے لیے فحش نویس ظریفانہ اخباروں کا ظہور ہوا ہے''۔(۷)

شذرات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بیسویں صدی کی دوسری دھائی کے وسط میں پنجاب میں طاعون کی وبا نے بے حد جانی نقصان کیا اور اس کا زیادہ تر شکار مسلمان ہوئے۔ اس شمارے کی واحد افسانوی تحریر بلقیس خاتون جمال بنت مولوی عبدالاحد کا ایک فسانہ ''عصمت کی دیوی'' ہے، یہ افسانہ ہندوستانی عورت کی عزت و عصمت کے لیے قربانی اور پتی ورتا کا ایک بے مثال نمونہ ہے۔ جس وجہ سے دیوتاؤں نے اسے ''عصمت کی دیوی'' کا خطاب دیا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک ہندو عورت تلوتما ہے۔

اس شمارے کے دیگر معلوماتی اور خوبصورت مضامین میں ملک عبدالقیوم کا ترکوں کی معاشرت، دینی مضامین میں مولانا محمد عبداللہ کا مضمون ''حسن معاملت'' ایک مسلمان کے قلم سے ایک فکرانگیز مضمون ''عمل'' میں اس دور کے مسلمانوں کی حالت زار کو یوں بیان کیا گیا ہے:

''مسلمانوں کی موجودہ پستی اور تنزل و کمزوری محض کام نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ مسلمان باتیں بہت کرتے ہیں لیکن کسی نظام و ضابطہ کے ماتحت عمل کرنا ان کے لیے محال ہے۔ قوم کی جہالت و لاعلمی کو دور کرنے کے لیے تعلیمی نظام پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ قوم کی مالی کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے قوم کو تجارتی و صنعتی کاموں میں حصہ لینے کی حاجت ہے''۔(۸)

عبدالرحمٰن چغتائی جن کو اس شمارے میں ہندوستان کا مایہ ناز مصور کہا گیا ہے۔ ان کے فن کا نمونہ ایک مصورانہ کاوش ''لیلی کا تحفہ'' اور نثری تحریریں بہ عنوان ''حجازی شراب'' اور ''راوی''

بھی شامل ہیں۔ایڈیٹر نے اس پر ایک مختصر شذرہ رقم کیا ہے اور اس اسلوب نثر کو جو رنگینیِ عبارت سے معمور ہے عبدالرحمٰن چغتائی کا خاص مصورانہ اسلوب قرار دیا ہے۔محمد دین تاثیر کا ایک مضمون ''فلسفہ اقبال'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔اس میں انھوں نے علامہ اقبال کی فکر کو مشرقی تناظر میں پیش کیا ہے اور معترضین کے اس اعتراض کو رد کیا ہے کہ اقبال کی فکر کا ماخذ مغربی افکار ہیں۔ اس شمارے میں ایڈیٹر حکیم یوسف حسن کا ایک مضمون ''میں کون ہوں'' کے عنوان سے طبع ہوا ہے۔ یہ مضمون انسان کو محنت اور عمل کا درس دیتا ہے۔اس میں قومی اور انفرادی سطح پر کام کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔''گل صد برگ'' کے عنوان سے ہندوستان کے اخبارات و رسائل کی منفرد تحریروں کے انتخاب کا ایک گوشہ ترتیب دیا گیا ہے۔جس میں دو مختصر تحریریں ''میں کہاں ہوں'' اور ''تاج آگرہ'' شائع کی گئی ہیں۔''اخبار علمیہ'' کے عنوان سے ''نیرنگ خیال'' میں ہندوستان کے اخبارات و رسائل کی منفرد و اہم تحریروں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ یہ نئی دریافتوں اور ایجادات سے متعلق ہیں۔''تنسیخ خلافت پر ایک محققانہ رائے'' کے عنوان سے آغا محمد صفدر کا ایک مضمون بھی شامل اشاعت ہے،جس میں تحریک خلافت کے تاریخی کردار کا جائزہ لیا گیا ہے۔''عہد حاضر کا مغل اعظم'' کے عنوان سے ایک تحریر کا انگریزی جریدہ سے ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔جس میں سنت نہال سنگھ نے مسلمان حکمران،شاہ دکن کے دولت کا ڈھیر رکھنے کے باوجود کفایت شعاری سے کام لینے اور سادہ زندگی بسر کرنے کو ہدف تنقید بنایا ہے۔جس کے جواب میں مدیر ''نیرنگ خیال'' نے شاہ دکن کی علم دوستی کا حوالہ دیتے ہوئے کفایت شعاری کو عین بہ مطابق اسلام بتایا ہے۔آخری صفحات میں ''پارہ دل'' کے عنوان سے خواجہ حسن نظامی کی ایک تحریر بھی شائع ہوئی ہے۔جس میں مسلم معاشرت کی اصلاح کے حوالے سے مختصر تحریریں جمع کی گئی ہیں جن میں مسلمانوں کو خاص طور پر عورتوں کو ہندوؤں کی شادی بیاہ اور دوسری رسموں سے اجتناب برتنے کی تلقین کی گئی ہے۔ شاعری کے ذیل میں جو منظومات اس شمارے میں شائع ہوئی ہیں ان میں ''طوق اور زنجیر سے گھبرائیں کیا'' مولانا اختر علی خان کی نظم ہے جو مولانا ظفر علی خاں کے صاحب زادے تھے۔

سنگدل ہے اس کے در پہ جائیں کیا ۔۔۔ اپنا سر پتھر سے ہم ٹکرائیں کیا
کس سے ہوگا چارہ درد فراق ۔۔۔ اس دل بیتاب کو سمجھائیں کیا

ہوچکے جب زلف پُر خم کے اسیر طوق اور زنجیر سے گھبرائیں کیا
دے کے ان کے ہات میں قسمت کی باگ اس کیے پر اپنے ہم پچھتائیں کیا
کج ادائی جس کا شیوہ ہوچکا حال دل اس شوخ کو بتلائیں کیا
داغ ہائے غم ہیں دل پر جابجا کھول کر سینہ انہیں دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں ہم سے وہ اختر کا حال
''کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا''(۹)

اس کے علاوہ ''نمود صبح'' کے نام سے محمد دین تاثیر ''برسات کی رت'' محمود حسن محمود اسرائیلی ''واردات قلب'' کے عنوان سے حامد اللہ افسر بی اے، ''ادبیات'' عزیز لکھنوی، ''افکار ناظم''، ابوالانظم محمد ناظم، حسیات شایق، سردار اودے سنگھ شائق کی خوبصورت نظمیں شائع ہوئی ہیں۔غزلوں میں ظہیری بدایونی، سہا، تاجور نجیب آبادی اور رابعہ پنہاں کی شاعری اس شمارے کی زینت ہے۔اسلامی دنیا کی مردم شماری کے عنوان سے آخری صفحات میں دنیا میں مختلف حوالوں سے دیے گئے اعداد شمار سے مسلمانوں کی آبادی کا تخمینہ لگانے کی سعی کی گئی ہے کہ:

''اس جدید حساب کی رو سے مسلمانوں کی تعداد ۲۳۴۸۱۴۹۸۹ ہے۔
جس میں سے دس کروڑ ستاون لاکھ تیئیس ہزار انگریزی جھنڈے تلے ہیں''۔(۱۰)

''مرقع الاخبار'' کے تحت واقعات حاضرہ کے حوالے سے ہاتھ سے بنائی گئی تصاویر بھی شائع کی گئی ہیں۔جن میں سے ایک محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ، ۲- غازی فتحی بے جو مسئلہ موصل، ۳- آغا محمد صفدر استقبالیہ کمیٹی تصویریں ہیں۔صفحہ ۵۱ پر ایک ادبی جریدہ اور ایک گلدستہ کا اشتہار بھی شائع ہوا ہے۔ان میں ایک دلکش لاہور جس کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۲۴ء میں شائع ہونا ہے۔دوسرا الکمال ہے جو عرصہ سے لاہور سے شائع ہوتا ہے اور اسے ہندوستان بھر کا واحد گلدستہ قرار دیا گیا ہے جو ملک وقوم کی خدمت کر رہا ہے۔مجموعی طور پر جولائی ۱۹۲۴ء میں ''نیرنگ خیال'' کا پہلا شمارہ متنوع دلچسپیوں کا محور ومرکز ہے۔یہ شمارہ حکیم یوسف حسن اور محمد دین تاثیر کی اجتماعی کوششوں کا ثمر ہے۔جنھوں نے اسے دلچسپ بنانے کے لیے مختلف علمی مذہبی اور قومی معاملات ومسائل پر بھی مضامین کو اس شمارے میں شامل اشاعت کیا۔اس دور کی مسلم معاشرت،

ہندوستان کے سیاسی ومعاشرتی حالات ادیبوں کی سوچ وفکر کا بھی یہ شمارہ آئینہ دار ہے۔اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''نیرنگ خیال'' محض ایک ادبی جریدہ ہی نہ تھا ایک علمی تحریک کا نام بھی تھا جس نے برصغیر کے عوام میں آزادی کا جذبہ ابھارنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

نقوش: ایک اور ایسا جریدہ ہے جس نے قیام پاکستان کے بعد اپنا سفر شروع کیا لیکن اردو کی ادبی صحافت میں اپنے لیے ایک الگ جگہ بنالی۔نقوش کے تمام اشاعتی سفر کے دوران اس کے خاص نمبر ہی اس کی وجہ شہرت بنے۔نقوش کا پہلا شمارہ مارچ ۱۹۴۸ میں منصۂ شہود پر آیا۔اس کے پہلے ایڈیٹر ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی تھے۔ان کی ادارت میں شمارہ ایک تا دس شائع ہوئے۔قاسمی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ نقوش کا نام انہوں نے تجویز کیا تھا(۱۱)، پہلے شمارے کا سرورق آذر زوبی نے بنایا تھا۔اس کی پیشانی پر ''زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا ترجمان'' کے الفاظ بھی قاسمی صاحب کے خلاق ذہن کی اختراع تھے۔محمد طفیل (۱۹۲۳-۱۹۸۶) جو نقوش کی بدولت محمد نقوش بن گئے تھے۔انہوں نے ۱۹۴۴ میں لاہور میں ادارہ فروغ اردو کی بنیاد رکھی تھی،نقوش کا اجراء اس کے تحت کیا گیا تھا۔نقوش نے کئی معرکۃ الآراء نمبر شائع کیے اور اپنے پیش روجرائد ''نگار'' اور ''نیرنگ خیال'' کی روایت کو آگے بڑھایا۔نقوش کا پہلا شمارہ ۸۶ صفحات پر مشتمل تھا۔طلوع کے نام سے اس کا اداریہ ہاجرہ مسرور نے لکھا ہے۔مضامین،افسانے اور شاعری کا بے حد متنوع اور معیاری انتخاب اس شمارے میں شامل اشاعت ہے۔افسانوں میں احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ''میں انسان ہوں'' اور ہاجرہ مسرور کا افسانہ ''بڑے انسان بنے بیٹھے ہو'' ۱۹۴۷ کے فسادات کے تناظر میں لکھے گئے ہیں اور انسانیت پر کیے گئے ظلم وستم کی المناک داستاں سناتے ہیں۔دیگر افسانوں میں کرشن چندر کا ''بھیروں کا مندر لمیٹڈ'' اور عزیز احمد کا ''میرا دشمن میرا بھائی'' بھی لائق مطالعہ ہیں۔مضامین میں خالد حسن قادری نے ''نیا افق'' کے عنوان سے نئے پاکستان کے احوال اور اردو زبان کو موضوع بنایا ہے عزیز احمد نے فرحت اللہ بیگ کی مزاح نگاری پر اور غلام رسول مہر نے کمال الدین اصفہانی پر مقالات تحریر کیے ہیں۔نقوش کے پہلے شمارے میں اردو زبان کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے اور اس بارے میں فلک پیما،ڈاکٹر عبدالحق، سیماب اکبر آبادی،خواجہ احمد فاروقی،احتشام حسین،نور الحسن ہاشمی اور خدیجہ مستور کے زریں

خیالات اور اردو کے فروغ کے لیے تجاویز شائع کی گئی ہیں۔غزلوں میں اثر لکھنوی، اختر شیرانی، فراق گورکھپوری، حفیظ ہوشیار پوری، علی سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، سیف الدین سیف، مختار صدیقی کی خوبصورت غزلیں شائع کی گئی ہیں۔نظموں میں حفیظ جالندھری، سیماب اکبرآبادی، یوسف ظفر، قتیل شفائی اور احمد ندیم قاسمی کی رباعیات شائع ہوئی ہیں۔ان صفحات سے اس دور میں دونوں جانب اردو شاعری اور غزل و نظم کے موضوعات اور معیار کو دیکھا جاسکتا ہے۔حالات حاضرہ کے تحت ایک مضمون ہاجرہ مسرور کا ہمارا سماج کے عنوان سے شائع ہوا، یہ ان عورتوں سے متعلق ہے جو فسادات میں اغوا ہوگئی تھیں۔ان کی واپسی نے دونوں جانب بہت سے سماجی مسائل کو جنم دیا۔یہ مضمون ان حالات کا تجزیہ کرتا ہے۔عبدالمجید سالک نے مسئلہ فلسطین کے حل کے لیے کی گئی کوششوں کا احاطہ کیا ہے، دیگر عنوانات کے تحت فلم کے عنوان سے ڈاکومنٹری کی اہمیت اور افادیت پر اے قدوس نے اپنے خیالات رقم کیے ہیں ''نئی کتابوں'' کے عنوان سے ہم وحشی ہیں کرشن چندر کے افسانوی مجموعہ پر ہاجرہ مسرور اور علی سردار جعفری کے شعری مجموعہ پر قاسمی صاحب نے تبصرہ کیا ہے۔بہ حیثیت مجموعی ''نقوش'' کا یہ شمارہ خوبصورت اور یادگار تحریروں کا ایک گلدستہ ہے جس کی مہک آج بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔

ماہ نو: حکومت پاکستان کا سرکاری ادبی جریدہ ہے جو ہندوستانی جریدے ''آج کل'' دہلی کے طرز پر نکالا گیا تھا۔وقار عظیم آج کل کے ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے۔پاکستان کا پہلا دارالحکومت کراچی تھا۔اس لیے اپریل ۱۹۴۸ میں ماہ نو کا پہلا شمارہ کراچی سے جلوہ گر ہوا۔معروف نقاد وقار عظیم اس کے مدیر تھے۔اولین شمارہ ۶۲ صفحات پر مبنی تھا۔ادب کے بڑے اہم نام اور ان کی تحریریں اس شمارے کی زینت تھیں۔''کچھ اپنی باتیں'' کے عنوان سے مدیر وقار عظیم نے اولین شمارہ کا اداریہ رقم کیا ہے۔صفحہ ۳ پر حامد حسن قادری نے ''تاریخ قیام پاکستان'' قرآن مجید سے نکالی ہے۔اس کے بعد خوبصورت اور معیاری نظموں اور غزلوں کا ایک انتخاب شائع کیا گیا ہے۔اس شمارے کی زیادہ تر تخلیقات آزادی اور فسادات کے تناظر میں لکھی گئی ہیں۔اسد ملتانی کی نظم ''غم نہ کر''، مسعود حسن کی نظم ''مدینہ آدم''، ش ضحیٰ کی نظم ''محسوسات'' اور وشوامتر عادل کی نظم ''نیند سے پہلے'' کے بنیادی استعارے اور لفظیات غم بے بسی اور اس سے جنم لینے والی یاسیت ہے جبکہ

احمد ندیم قاسمی کی نظم ''کل اور آج'' ان کے ترقی پسندانہ نظریات کی علم بردار ہے۔ اس شمارے کی واحد غزل فراق گورکھپوری کی ہے جو غزل کے روایتی موضوع کی حامل ہے اور اس میں کوئی نیا پن نہیں ہے۔ افسانوں میں کرشن چندر کا ''لال باغ'' آغا محمد اشرف کا ''دلی کا ایک پودہ'' خواجہ احمد عباس کا افسانہ ''میں کون ہوں'' فسادات کے موضوع پر ہیں۔ اس شمارے کے قابل مطالعہ اور اہم مضامین میں خواجہ غلام السیدین کا مضمون ''آندھی میں چراغ'' قومی ترقی کے موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔ علی سردار جعفری کا مضمون ''اقبال کی آواز'' اقبال کی شاعری میں حرکت وعمل کے پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ سید احتشام حسین نے ''اردو کا لسانیاتی مطالعہ'' میں زبان کے مطالعہ کے لیے صوتیات اور لسانیات کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اختر حسین رائے پوری کا مضمون ''پاکستان کے بعض تعلیمی مسائل'' اس میں نو زائیدہ ملک میں تعلیم کی حالت زار اور مستقبل کے تعلیمی منصوبوں پر سوچ بچار شامل ہے۔ جس کا ایک پیراگراف حکومتوں کے طرز عمل اور سوچ وفکر کی عکاسی کرتا ہے۔ جس کا تسلسل آج بھی جاری ہے۔

اختر حسین رائے پوری لکھتے ہیں:

> ''تعلیم کے متعلق ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ اس پر خزانہ کے روپے صرف کرنا اگر فضول خرچی نہیں تو زکوۃ یا خیرات کے قسم کی کوئی چیز ہے جس کا حاصل مادی اعتبار سے کچھ نہیں''۔(۱۲)

''اتاترک کی وصیت'' آغا محمد یعقوب دواشی کا مضمون ہے جس میں اتاترک کی ایک تقریر کا اقتباس دیا گیا ہے جو پارٹی کی ایک کانگریس میں چھ دن جاری رہی تھی دیگر مضامین میں سید وقار عظیم نے شاہ عبداللطیف بھٹائی کا تعارف اور فضل حق قریشی دہلوی نے مغلوں کے فن خطاطی پر ایک دلچسپ اور معلوماتی مضمون تحریر کیا ہے۔ صفحہ ۵۵ پر دونئی اردو فلموں اور نئی کتابوں کے عنوان سے علی سردار جعفری کی نظموں کے مجموعے ''نئی دنیا کو سلام'' اور اوپندر ناتھ اشک کے ڈراموں کے مجموعہ ''ازلی راستے'' پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ جریدے کے وسط میں قیام پاکستان سے متعلق کئی اہم تصاویر بھی شائع کی گئی ہیں۔ ماہ نو کا اشاعتی سفر آج بھی جاری ہے۔ اب یہ لاہور سے شائع ہوتا ہے اور علمی ادبی حلقوں میں ایک معتبر ادبی جریدہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے سینکڑوں

صفحات پر پاکستانی ادب کے عظیم جواہر پارے اور ادب کی تاریخ بھی ثبت ہے۔

حوالے وحواشی

(۱) ادبی دنیا، لاہور، نوروز نمبر، ۱۹۳۲، ج ٦، ش ا، ص ۹۸۔ (۲) ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے کہ ''نگار کا اجراء آگرہ سے ہوا اور پہلا جریدہ ۲۲ رفروری ۱۹۲۲ کو شائع ہوا، ص ۸٦، ماہ نامہ انشاء کلکتہ دسمبر ۱۹۹٦، نیاز فتح پوری نمبر، مانک ٹالہ نے ص ۱۴۸ پر یہی بات دہرائی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی کتاب ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ''، مطبوعہ ۱۹۹۲ میں ص ۱۱۷ پر لکھا ہے ''بھوپال سے فروری ۱۹۴۴ میں نگار جاری ہوا''۔ رسالے کے ابتدائی صفحات میں ایسا کچھ نہیں پرنٹ ہوا کہ یہ پرچہ کہاں سے شائع ہو رہا ہے۔ ص ۵۳ پر لکھا ہے ایڈیٹر سے خط و کتابت کا پتہ، نور محل بھوپال ہے۔ امکان غالب ہے کہ نیاز فتح پوری بھوپال میں مقیم تھے اور پرچہ آگرہ سے جاری کیا گیا۔ (۳) اردو جامع انسائیکلو پیڈیا، ج ۲، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۸۸ نے ص ۱۹۱۰ پر لکھا ''نیرنگ خیال لاہور ۱۹۲۲ میں نکلا جو کہ غلط ہے''۔ (۴) محمد طفیل، حکیم صاحب (خاکہ) مطبوعہ نقوش لاہور، محمد طفیل نمبر، ج ۲، ش ۱۳۵، جولائی ۱۹۸۷، ص ۱۰۷٦۔ (۵) برنی، سید مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال، ج ۲، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۳، ص ۵۳۲۔ (٦) حکیم یوسف حسن کی وفات پر شان الحق حقی نے تاریخ وفات کہی ہے

اٹھ گیا بانی میخانہ نیرنگ خیال
لجہ دود ہوا عرصہ نیرنگ خیال

۱۴۰۱ ھ

بحوالہ سہ ماہی اردو، کراچی، ج ٦١، ش ۳، ۱۹۸۵، ص ۳۳۔ (۷) نیرنگ خیال، ماہ نامہ، لاہور، ج ا، ش ا، ۱۹۲۴،۔ (۸) ایضاً، ص ۲۷۔ (۹) ایضاً، ص ۳۸۔ (۱۰) ایضاً، ص ۴۷۔ (۱۱) بحوالہ نقوش، محمد طفیل نمبر، ج ا، ص ۱۷۔ (۱۲) رائے پوری، اختر حسین، ماہ نو، کراچی، ج ا، ش ا، اپریل ۱۹۴۸، ص ۲۸۔

اخبار علمیہ

''برطانوی ادب کا ۳۲ فیصد حصہ اسلام مخالف مواد پر مشتمل''

عرب خبر رساں ادارہ ''الجزیرہ'' کے مطابق برطانیہ میں حالیہ پانچ برسوں کے دوران شائع شدہ تحریروں کا ۳۲ فیصد حصہ اسلام مخالف مواد پر مشتمل ہے، ''اسلاموفوبیا'' مغربی ذرائع ابلاغ کا سب سے مشہور لفظ ہے اور دہشت گردی کے کسی واقعہ میں مسلمانوں کا نام لینا ان کا معمول بن گیا ہے، اس کے باوجود وہاں قبول اسلام کے واقعات میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے، گذشتہ برسوں میں تیس ہزار برطانوی شہریوں نے اسلام کے پرامن سماجی و معاشرتی نظام کی حقانیت تسلیم کر کے مسلمان ہونے کا شرف حاصل کیا، جائزہ میں قبول اسلام کے اہم اسباب میں اسلام کا ازدواجی نظام، حسن اخلاق، پڑوسیوں سے بہتر تعلقات اور رشتہ داروں اور قرابت داروں کے حقوق کی ادائیگی پر مشتمل تعلیمات کو قرار دیا گیا ہے اور یہ بھی کہ مغربی نظام میں ہر شعبۂ حیات میں بے اعتمادی، بدعہدی و خودغرضی اور بے اطمینانی کی کیفیت اور تجربہ نے ان کو اپنے آبائی دین و مذہب سے برگشتہ کر دیا ہے۔

''پشمینا بکری کا کلون''

جنین کے خلیوں کی مدد سے ۱۹۹۶ء میں کلوننگ کے ذریعہ اسکاٹ لینڈ کے محققین نے دنیا کی پہلی بھیڑ تیار کی تھی جس کا نام انہوں نے ''ڈلی'' رکھا تھا اور ۲۰۰۳ء میں اس کی موت بھی ہوگئی تھی، اس سائنسی تحقیق کے بعد کلوننگ کے غلط استعمال کے امکانات و خدشات پر مباحثہ شروع ہوا اور انسانی کلوننگ کو بین الاقوامی قوانین میں ممنوع قرار دیا گیا لیکن جانوروں کی کلوننگ پر پابندی نہیں ہے، ابھی حال ہی میں جموں کے شیر کشمیر زراعت سائنس اینڈ ٹکنالوجی سے وابستہ پروفیسر ریاض احمد شاہ اور ان کی تحقیقاتی ٹیم نے پہلی بار پشمینا بکری کا کلون تیار کیا ہے، ان کے بیان کے مطابق اس کلون میں ڈلی کی کلوننگ سے الگ ٹکنک یا طریقہ استعمال کیا گیا ہے اور اس لحاظ سے یہ دنیا کا پہلا پشمینا کا کلون ہے، پشمینا لداخ میں پائی جاتی ہے، اس کے بالوں سے اُون تیار ہوتا ہے، اس کلوننگ کا مقصد پشمینا کی افزائش و پیدائش میں اضافہ بتایا گیا ہے۔

''دماغی صلاحیت میں ۶ء۳ فیصد کمی''

برٹش میڈیکل جرنل کے مطابق ۴۵ سال کی عمر کے بعد مردو خواتین کی دماغی صلاحیت میں ۶ء۳ فیصد کمی واقع ہوجاتی ہے، یونیورسٹی کالج لندن کے محققین نے ۴۵ سے ۷۰ سال کے درمیان کے سات ہزار مردوں اورعورتوں کی یادداشت، ذخیرہ الفاظ اور ذہنی لیاقت کے جائزہ میں دس برس کا عرصہ صرف کیا تو انہیں مذکورہ نتیجہ کا علم ہوا، وہ اصلاً مخبوط الحواسی کی ابتدائی تشخیص کے لیے دماغوں میں ہونے والے تغیر وتبدل کے موضوع پر تحقیق کررہے تھے، تاکہ اس سے علاج میں کچھ مدد لی جاسکے، اس سے پہلے کی تحقیق یہ تھی کہ ۶۰ برس سے قبل دماغی صلاحیتوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی مگر جدید تحقیق کے مطابق ذہنی انحطاط وزوال کا آغاز سن رشد کی تکمیل کے بعد ہی ہونے لگتا ہے۔

''Correct Sex یعنی جنس صحیح کا عمل''

عربی روزنامہ ''القدس العربی'' میں شائع خبر کے مطابق ۱۸ سے ۲۰ سال کی تین شادی شدہ خواتین جنسی مشکلات کے پیش نظر آپریشن کے ذریعہ مرد بن گئی ہیں، ملک عبدالعزیز یونیورسٹی اسپتال کے صدر شعبہ جراحت یاسر صالح جمال کا بیان ہے کہ تبدیلی جنس شرعاً ممنوع اور سعودی عرب میں اس پر قانوناً پابندی ہے اس لیے کہ اس کے ذریعہ خدائی تخلیق کو تبدیل کیا جاتا ہے لیکن Correct Sex یعنی صحیح جنس کی کارروائی درست و جائز ہے اور یہ ایسے افراد پر کی جاتی ہے جو باضابطہ شرعی کونسل کی اجازت اور وزارت صحت کی تصدیق کے بعد ہمارے پاس آتے ہیں، انہوں نے مزید کہا کہ اس قسم کے ۹۰ مریضوں کی ایک طویل فہرست ہمارے پاس موجود ہے جو Correct Sex سرجری کے خواہش مند ہیں۔ بہت سی ایسی درخواستیں بھی ہمارے سامنے پیش کی گئی ہیں جن میں اس آپریشن کو دیکھنے کا ذکر ہے لیکن شرعی اور قانونی ممانعت کے سبب انہیں مسترد کردیا گیا ہے۔

''اب صرف نٹ پر......''

گذشتہ کئی برسوں سے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی فروخت میں زبردست کمی آئی ہے اور

محققین کے لیے ضخیم جلدوں کے بہ جائے انٹرنٹ پر دستیاب مواد کا استعمال آسان ہوگیا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس کا جدید ترین اور کامل ترین نسخہ اشاعت کے بعد ہی، جدت و کاملیت کی خصوصیت کھو بیٹھتا ہے اسی لیے استعمال کنندگان نٹ پر موجود مواد کو کتاب میں شائع شدہ مواد کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں، ادارہ کے ذمہ داروں نے اسی لیے اس حوالہ جاتی کتاب کے جدید ایڈیشن کو کتابی شکل میں شائع نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کا نیا شمارہ صرف نٹ پر ہی دستیاب ہوگا۔

"حقوق انسانی اداروں کی اصلاح کی ضرورت"

"مرکز حقوق انسانی برائے ایشیا کی رپورٹ کے مطابق گذشتہ دس برسوں میں پولیس اور عدالت کے زیر حراست کل ۱۴۲۳۱ قیدیوں کی اموات ہوئیں یعنی روزانہ قریب ۴ قیدی جیل کے ساتھ زندگی کی قید سے بھی آزاد ہوجاتے ہیں، یہ مذکورہ موتیں ۱۵۰۴ پولیس کی تحویل اور ۱۲۷۲۷ عدالتی حراست میں ہوئیں، تفصیل کے مطابق یوپی کے ۲۳۱، بہار کے ۱۳۶، مہاراشٹر کے ۱۳۰، آندھرا پردیش کے ۱۰۶، پنجاب کے ۹۶، راجستھان کے ۸۵، مدھیہ پردیش کے ۸۴، تمل ناڈ کے ۷۷، گجرات کے ۵۷ اور ویسٹ بنگال کے ۳۷ قیدی تھے، اس کے لیے اقوام متحدہ نے ہندوستان میں قائم حقوق انسانی تنظیم کی کارکردگی پر بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے، دولت مشترکہ حقوق انسانی کے ڈائریکٹر نے بھی ہندوستان میں موجود حقوق انسانی کے اداروں کو زیادہ درست اور مزید فعال بنانے کی ضرورت پر زور دیا ہے، تفصیلی رپورٹ ملی گزٹ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

"خراب پانی سے بجلی تیار کرنے والی مشین"

رسالہ سائنس میں پین اسٹیٹ یونیورسٹی کے محققین کی شائع تحقیق کے مطابق ایک ایسی مشین ایجاد کی گئی ہے جس کے ذریعہ خراب یا استعمال شدہ پانی سے بجلی تیار کی جاسکے گی اور گندے پانی کو اس کے ذریعہ صاف و شفاف بھی بنایا جاسکے گا، بجلی بنانے کی اس ترکیب کو ماہرین نے "ریڈ" یعنی "رورس الیکٹروڈائیلیسز" کا نام دیا ہے۔

ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

تصوف کیا ہے؟

شعبہ اسلامیات،
عربی، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

مدیر محترم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دور حاضر میں انتہا پسندی اور دہشت گردی کی اصطلاحات اگرچہ اپنا سیاسی اور مغربی پس منظر رکھتی ہیں مگر ان کو دیگر شعبہ ہائے حیات سے منسلک کیا جائے تو علمی انتہا پسندی اور علمی دہشت گردی کی اصطلاحات کو ہم مستشرقین اور دیگر اسلام مخالف قوتوں کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ جن سے مخلص اہل علم بھی تشکیک اور غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پھر ان غلط فہمیوں کو مخلص اصحاب قلم اپنی تحقیق کا موضوع بناتے ہیں۔ ایک ایسی ہی غلط فہمی پر مبنی مضمون عزت مآب جناب الطاف احمد اعظمی کا ہے جو انہوں نے تصوف کی حقیقت و ماہیت پر تحریر فرمایا ہے۔ مضمون کی ابتدا میں تصوف کو ماننے اور نہ ماننے والے مختلف گروہوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ ''ایک طبقے کا خیال ہے اور ان کی تعداد زیادہ ہے کہ تصوف عین اسلام ہے''(۱) جب اہل علم کی ایک کثیر تعداد اس کو صحیح سمجھتی ہے تو اہل علم کی اصطلاح میں ''جمہور'' کا فیصلہ قبول کر لینا چاہیے۔ مگر اعظمی صاحب نے انتہائی بے خوفی کے ساتھ لکھا ''قارئین نے دیکھ لیا کہ صوفیاء نے تصوف کے پردے میں کس بے خوفی کے ساتھ کھلم کھلا کفر و شرک کی باتیں کی ہیں۔ پھر بھی ہمارے صوفی علماء کہتے ہیں کہ تصوف عین اسلام ہے۔ یہ تصوف ہی ہے جو شاہ ولی اللہ دہلویؒ جیسے نابغہ روزگار عالم دین کو غلط راہ میں لے گیا......''(۲) دور حاضر متانت و سنجیدگی کا عہد ہے۔ تحقیق میں اعتدال اور لفظوں کے استعمال میں احتیاط الفاظ کی حرمت کو قائم رکھتی ہے۔ شاہ ولی اللہ ''نابغہ روزگار عالم دین'' ہیں اور غلط راہ پر بھی؟

افراط وتفریط اوراقوال کی کثرت دیکھ کر اگر بعض لوگ تفسیر، حدیث اور فقہ جیسے فنون کا انکار کردیں تو بجا ہے۔ اکبر کے دربار میں موجود علماء کی افراط وتفریط نے حالات کو کیا سے کیا کر دیا؟ ابوالفضل، فیضی، ابراہیم سرہندی، عبداللہ سلطان پوری دربار اکبری میں فقہی نظائر سے ہی دل بہلایا کرتے اور مادی مفاد سے لطف اندوز ہوتے تھے (۳) اعظمی صاحب نے کتب تصوف سے تصوف کے بارے میں مختلف آراء نقل کیں ان تعریفات کے دوسرے پہلو بھی تھے جو انہیں امہات کتب میں درج ہیں اگر ان کو بھی سامنے رکھ لیا جاتا اور معاشرہ میں علماء اور عوام کی دوسری طرف انتہائی منفی رویوں اور سرگرمیوں کو بھی پیش نظر رکھا جاتا تو وہ غلط فہمیاں پیدا نہ ہوتیں جو اس مضمون سے ظاہر ہیں۔

''شیخ ابوالحسن علی ہجویری (م: ۴۶۰ء/۱۰۳۷ھ) بڑے پایہ کے صوفی بزرگ گذرے ہیں اور لاہور میں مدفون ہیں'' (۴) کی آراء سے آغاز کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

۱- ابوالحسین نوری کا قول: تصوف رسوم وعلوم کا نام نہیں بلکہ اخلاق عالیہ کا نام ہے اس قول پر شیخ ہجویری کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیں:

> ''تصوف رسوم وعلوم نیست ولیکن اخلاق است، یعنی اگر رسوم بودی بہ مجاہدات حاصل شدی واگر علوم بودی بہ تعلم بہ دست آمدی، لیکن اخلاق است تا حکم آن از خود اندر نخواہی ومعاملت آن با خود درست نکنی وانصاف آن از خود نہ ہی حاصل نگردد''۔ (۵)

اس سلسلہ میں مرتعش کا یہ قول بھی نقل کیا ہے: التصوف حسن الخلق ابوعلی قرمینی کا بھی ایسا ہی قول ذکر کیا ہے۔ (۶)

۲- ابوالحسن قوشنجہ کا قول اس طرح نقل کرتے ہیں: التصوف الیوم اسم بلا حقیقة، وقد کان من قبل حقیقة بلا اسم۔ (۸)

مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''یہاں تک مشائخ تصوف کے اقوال بہ تحقیق اس کتاب میں نقل کیے گئے ہیں تاکہ تجھ پر اسی طریقہ تصوف کی راہ کشادہ ہو اور منکرین کو مطلع کرسکوں کہ انکار تصوف سے ان کی کیا مراد ہے اگر اسم مجرد کا انکار کرتے ہیں تو کوئی رد نہیں کیوں کہ معانی حقائق ناموں سے بالکل بیگانہ ہوتے ہیں اگر منکرین عین تصوف کا انکار کرتے ہیں تو پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کی پوری شریعت اور آپ کے فضائل حمیدہ کا انکار ہوگا'' (۹) اس اقتباس

سے یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ تصوف شریعت اور سیرت مصطفیٰ کا بیان ہے ایسے افکار اور خیالات کا مجموعہ نہیں جن سے عقائد اور اعمال پر زد پڑتی ہو، شیخ ہجویری نے ہی صوفیہ کے بارہ گروہوں کا ذکر کیا ہے جن میں دس مقبول اور دو مردود ہیں۔

ان دس کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ان میں سے ہر ایک کا مجاہدات میں اپنا اپنا پسندیدہ طریقہ اور عمدہ معاملات ہیں اور مشاہدات میں ادب لطیف۔ ہر چند وہ معاملات، مجاہدات، مشاہدات اور ریاضات میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن اصول وفروع شرع اور توحید میں موافق و متفق ہیں۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا ہے کہ توحید خالص کے سواء علماء کا اختلاف رحمت ہے''۔(۱۰)

یہ اقتباس بھی ظاہر کرتا ہے کہ عقائد اور معاملات کے اصول میں صوفیہ کا اتفاق ہے فروع میں اگر اختلاف ہے تو یہ فقہاء میں بھی ہے اس بنیاد پر فقہاء کی کاوشوں کا انکار تو نہیں کریں گے۔ مردود فرقوں کے ذکر میں شیخ مذکور نے بات کو اور واضح کردیا: ''جو بھی توحید و تحقیق کے خلاف باتوں کا قائل ہوا اسے دین سے کوئی حصہ نصیب نہیں ہوتا۔ جب دین ہی مضبوط نہ ہو جو اصل ہے تو تصوف جو نتیجہ وفرع ہے بدرجہ اولی خلل پذیر ہوگا''۔(۱۱)

میں نہیں سمجھتا کہ توحید کے حوالے سے اس بیان کے بعد صوفیہ پر طعن کا جواز رہ جاتا ہے۔

تصوف کی ایک دوسری معروف کتاب اللمع ہے۔ اس میں ابونصر سراج طوسی (م:۳۷۸ھ) لکھتے ہیں: ''ذوالنون مصریؒ سے صوفی کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا'' یہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کو ہر چیز پر ترجیح دی ہوئی ہے۔ لہٰذا اللہ بھی انہیں ہر چیز پر ترجیح دیتا ہے''۔(۱۲)

تصوف کے تین پہلو ہیں:

(الف) نظری۔ (ب) عملی۔ (ج) تاریخی۔

اگر ان تینوں پہلوؤں میں علاقائی اور دیگر علوم کے اثرات کے نتیجے میں انحرافات واقع ہوئے تو اس وجہ سے حقیقت کا انکار کردینا تو انصاف نہیں۔ نفی تصوف اور نمائش تصوف میں ہمیں حقیقت تصوف کی تلاش ضرور کرنی چاہیے۔

ان امور کے علاوہ صوفیہ کے علوم وفنون پر اثرات، تہذیب اسلامی کی روح کو باقی رکھنے

کے لیے اقدامات، اخلاقیات کے فروغ میں ان کی کاوشیں، خدمت خلق کی تگ وتاز، اور اصلاح معاشرہ کی کوششیں، کیا سب کام مقاصد شریعہ کے حصول کے لیے نہیں ہیں؟ ان ساری چیزوں کے باوجود حضرت مجدد کا یہ اظہار حقیقت حرف آخر کے طور پر پیش خدمت ہے۔

اس گروہ صوفیہ کے علوم، علوم احوال ہیں اور احوال اعمال کے نتائج وثمرات ہیں اور علوم احوال اسے عطا ہوتے ہیں جس کے اعمال درست ہوں اور جس نے اعمال کا حق ادا کیا ہو اور اعمال کی درستی اس وقت میسر آتی ہے جبکہ اعمال کو پہچانے پر عمل کی کیفیت سے واقف ہو اور اعمال کو جاننا اور ان کی کیفیت سے واقف ہونا احکام شرعیہ کا علم ہے جیسے نماز، روزہ اور باقی فرائض اور معاملات کا علم اور نکاح وطلاق اور بیع وشراء کا علم۔ اور ہر اس شے کا علم جو اللہ تعالیٰ نے بندے پر واجب کی ہے اور جس کی بندے کو دعوت دی ہے اور یہ علوم کسب وسعی سے حاصل ہوتے ہیں اور ان کے سیکھنے کے بغیر چارہ نہیں۔ (۱۳)

ان اقتباسات کی روشنی میں ہمیں یہ طے کرلینا چاہیے کہ تصوف شریعت پر اس کی روح کے مطابق عمل کرنے سے عبارت ہے اور جو انحرافات ہوئے وہ ہمارے دیگر علوم وفنون میں بھی ہوئے جن کی بنا پر ہم ان کا انکار نہیں کرتے اس کا انکار بھی نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے ہاں اس فیشن کی حوصلہ شکنی بھی ضروری ہے جو ہم اپنی متجددانہ فکر کی آڑ میں اسلاف پر طعنہ زنی کرتے ہیں۔ اختلاف رائے اپنی جگہ لیکن شاہ ولی اللہؒ کے بارے میں معارف نے جو کچھ شائع کردیا وہ اس علمی تحقیقی اور قدیم رسالہ کے شایان شان نہیں اگر شائع کرنا ہی تھا تو مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کا مضمون جو ۱۹۳۵ء میں چھ قسطوں میں شائع ہوا تھا (۱۴) اس کی تلخیص شائع کردی جاتی تا کہ تصوف کے بارے میں جس علمی انتہاپسندی کا مظاہرہ اعظمی صاحب نے کیا قارئین اس سے بچ سکتے یہ سطور اعظمی صاحب کے مقالہ کا رد ہیں نہ تصوف پر ایک مربوط ومبسوط مقالہ، صرف اس بات کا اظہار ہے کہ ہمارے غیر معتدل اور غیر متوازن رویوں نے قوم کو جو نقصان پہنچایا ہے ہمیں اب اس سے بچنا ہے۔

والسلام ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس

حوالہ جات

(۱) معارف، جنوری ۲۰۱۲ء، ص ۵۔ (۲) ایضاً، ص ۲۴۔ (۳) پروفیسر محمد اسلم کی کتاب دین الٰہی اور اس کا پس

منظر ملاحظہ فرمائیں ۔ (۴) یہ الفاظ اعظمی صاحب نے درج کیے ہیں ۔ (۵) کشف المحجوب (تحقیق ڈاکٹر محمود عابدی)، ص ۵۷-۵۸ ۔ (۶) ایضاً ۔ (۷) ایضاً ۔ (۸) ایضاً، ص ۵۹ ۔ (۹) ایضاً ۔ (۱۰) ایضاً، ص ۲۶۷ ۔ (۱۱) وچون دین ۔ کہ اصل است ۔ مستحکم نبود، تصوف کہ نتیجہ وفرع است اولی تر کہ باخلل باشد (ایضاً، ص ۳۸۲) ۔ (۱۲) کتاب اللمع (مترجم ڈاکٹر پیر محمد حسن)، ص ۶۰ ۔ (۱۳) مکتوبات امام ربانی، دفتر اول، مکتوب ۲۹ ۔ (۱۴) ان مقالات کو ''تصوف کی اجمالی تاریخ اور اس پر نقد و بحث'' کے نام سے مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن نے ۲۰۰۶ء میں کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔

تصوف کیا ہے؟

۱۹/ مارچ ۲۰۱۲ء

پٹنہ

مکرمی! سلام واحترام۔

معارف پابندی سے موصول ہو رہا ہے۔ تھینک یو، شکریہ۔

فارسی تو نہیں آتی البتہ ادبیات کے تحت جو منظومات بہ زبان اردو شائع ہوتی ہیں ۔ ان کا غایت دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہوں اور سیراب ہوتا ہوں ۔ فروری کے شمارے میں رئیس احمد نعمانی کی نعت اپنی متانت اور رسول عربیؐ سے بے ریا عقیدت کے سبب متوجہ کرتی ہے ۔ نعت ہمیشہ اپنے لیے لکھی جاتی ہے۔

دل سوز سے خالی ہے تو ساز اٹھانا کیا۔ اے کاش کہ داد و تحسین، نذرانہ اور نام و نمود کے لیے نعت لکھنے والے حضرات بھی جناب رئیس احمد نعمانی کی طرح دوران نعت گوئی اس بار گراں کو اٹھانے کے متحمل ہو پاتے۔

یہ باتیں اتفاقاً لکھ گیا۔ جنوری اور فروری کے شمارے میں آپ نے پروفیسر الطاف احمد اعظمی کا مضمون ''تصوف کیا ہے'' دو قسطوں میں شائع فرمایا ہے۔ فروری ہی کے شمارے میں تصوف کیا ہے کے عنوان سے ایک خط بھی شامل ہے۔ سچ جانیے اس مضمون کے مطالعہ سے میرے علم میں اضافہ ہوا لیکن اسی کے ساتھ افسوس بھی ہوا کہ متصوفین کو نہ سمجھنے کی وجہ سے تصوف کو سمجھنے میں چوٹ کھا گئے

آپ اگر صاحب کتاب (رسولؐ) کی سیرت اور مزاج سے واقف نہیں تو کتاب کو کیا خاک سمجھیں گے۔
ویسے بھی کہا جاتا ہے ولی را ولی می شناسد۔صوفی اللہ کے ولی ہی تو ہوتے ہیں۔　　خیر طلب

خالد عبادی

حجیت حدیث کا موجودہ لٹریچر

۱۷رجنوری ۲۰۱۲ء
تغلق آباد، نئی دہلی

مدیر محترم!　　　سلام مسنون

معارف (دسمبر ۲۰۱۱ء) میں ڈاکٹر محمد عبداللہ عابد کے مضمون ''برصغیر میں حجیت حدیث کے بارے میں موجودہ لٹریچر کا جائزہ'' کی پہلی اور دوسری قسط کو میں نے غور سے پڑھا۔ یہ مضمون اس اعتبار سے قابل قدر ہے کہ اس میں موضوع سے متعلق بیشتر لٹریچر کا احاطہ کیا گیا ہے اور مختصراً ان کا تعارف بھی کرادیا گیا ہے۔

دوسرے دینی امور کی طرح حدیث بالخصوص دین میں اس کے واقعی مقام کے بارے میں اہل علم کے درمیان اختلاف رہا ہے اور اس میں واضح طور پر افراط وتفریط کا رجحان ملتا ہے۔ ایک طرف وہ اصحاب علم ہیں جو حدیث کی حجیت کا سرے سے انکار کرتے ہیں، اور یہ تفریط ہے۔ انہی لوگوں کو منکرین حدیث کہتے ہیں۔ دوسری طرف وہ علماء ہیں جو غلو کی حد تک حجیت حدیث کے قائل ہیں اور یہ افراط ہے۔ اس غلو کی انتہا یہ ہے کہ اس گروہ کے بعض غالی علماء نے لکھا ہے کہ حدیث قرآن کی ناسخ ہے یعنی اس کے کسی حکم کو منسوخ کرسکتی ہے۔ (نعوذ باللہ)

حجیت حدیث کے سلسلے میں منکرین حدیث کے اعتراضات کے جو جوابات وقتاً فوقتاً مختلف علماء کی طرف سے دیئے گئے ہیں فاضل مضمون نگار نے ان کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ان جوابات کو پڑھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ حجیت حدیث کے قائل علماء کے دلائل تسلی بخش تو کجا ان سے منکرین حدیث کے پیدا کردہ شکوک کو مزید تقویت ملتی ہے۔ یہاں تفصیلی گنجائش نہیں، صرف وہ جواب نقل کرتا ہوں جو خود فاضل مضمون نگار کا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے: ''قرآن مجید کی مختلف آیات ایسی ہیں جن کے معنی تمثیلی اور مجازی ہیں۔ ایسی آیات کے مفہوم کے سمجھنے کے لیے رہنمائی درکار ہے۔

قرآن مجید میں آیات دو قسم کی ہیں، یعنی محکمات اور متشابہات۔ متشابہات کو حضور اکرم کی رہنمائی کے بغیر کیسے سمجھا جائے گا۔ حدیث اور سنت ان متشابہات کی توضیح وتشریح ہیں۔ قرآن مجید نے زیادہ تر مسائل میں اصول وکلیات بتائے ہیں ان کی تفصیل اور جزئیات کا علم حدیث کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں، مثلاً زکوٰۃ کی شرح، نماز، روزہ اور حج کے تفصیلی احکامات وغیرہ''۔ (معارف، ص ۴۲۷)

اس اقتباس سے کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں، مثلاً (۱) کیا آیات متشابہات کا واقعی فہم ممکن ہے؟ اس سلسلے میں آل عمران کی آیات ۷، ۸ کی وضاحت ضروری ہے۔ (۲) کیا مستند احادیث میں آیات متشابہات کی توضیح کی گئی ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو ایک دو حدیثیں نقل فرمادیں۔ (۳) قرآن میں زیادہ تر احکام کے اصول وکلیات بیان کیے گئے ہیں اور خود فاضل مضمون نگار نے اس کا ذکر کیا ہے، ان اصولی احکام کی تفصیل کیوں نہیں کی گئی؟ (۴) زکوٰۃ کے مصادر متعین کردیے گئے ہیں (سورۂ توبہ: ۶۰) لیکن اس کا نصاب مقرر نہیں کیا گیا، کیوں؟ (۵) قرآن میں وضو کی تفصیل ہے (مائدہ: ۶) لیکن طریقۂ نماز کی تفصیل نہیں کی گئی، کیوں؟ کیا وضو کی طرح دو چار آیات کے ذریعے نماز پڑھنے کا طریقہ نہیں بیان کیا جاسکتا تھا۔ ملحوظ رہے کہ قرآن میں صلوٰۃ خوف کی ادائیگی کا طریقہ بتایا گیا ہے (سورۂ نسآء: ۱۰۲)۔ (۶) متعدد جدید علماء نے لکھا ہے کہ اقوال رسولؐ کی صحت کی کسوٹی قرآن مجید ہے۔ کیا فاضل مضمون نگار کو اس سے اتفاق ہے؟

فاضل مضمون نگار نے مولانا سید محمد امین الحق قادری کی کتاب سے ایک اقتباس نقل کیا ہے جس کا ایک جملہ یہ ہے: ''قرآن شریف کی مراد بیان کرنے کے لیے رسولؐ کے توسط کے بغیر چارہ نہیں''۔ (معارف، ص ۴۲۹) یہ جملہ انتہائی حد تک مغالطہ انگیز ہے۔ قرآن کی متعدد آیات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے معنی ومفہوم کے اعتبار سے ان لوگوں کے لیے بالکل واضح ہے جو علم وتقویٰ رکھتے ہیں، نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اپنی آیات کا خود شارح ہے، جہاں ایک بات مجمل ہے دوسری جگہ اس کی تفصیل کردی گئی ہے۔ (آیات احکام اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں)۔ اس سلسلے میں چند آیات نقل کرتا ہوں جو اثبات مدعا کے لیے کافی ہیں: (۱) ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (قیامہ: ۱۹) ''پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی وضاحت''، (۲) يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ (نسآء: ۱۷۶) ''اللہ تمہارے لیے وضاحت سے بیان کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہوجاؤ''،

(۳) اُنظُرْ كَيفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ (سورۂ انعام:۶۵) ''دیکھو، ہم کس طرح اپنی آیات کو مختلف پہلوؤں سے (یعنی اسلوب بدل کر) بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھ لیں''، (۴) قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ (انعام:۹۸) ''ہم نے اپنی آیات کو ان لوگوں کے لیے خوب کھول کر بیان کردیا ہے جو سمجھنا چاہیں''، (۵) وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ الخ (سورہ نحل:۸۹) ''اور ہم نے تم پر کتاب نازل کی ہے جو (دین سے متعلق) ہر بات کو بیان کرنے والی ہے''، (۶) قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (سورہ زمر:۲۸) ''وہ عربی قرآن ہے جس میں ذرا کجی نہیں (یعنی جس کے معنی و مضمون میں کوئی ابہام و اشکال نہیں، بالکل راست کلام) تاکہ یہ لوگ ڈریں''، (۷) الٓرٰ قف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (سورہ ہود:۱) ''الرا، یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات (پہلے) محکم کی گئی ہیں، پھر خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے ان کی وضاحت کی گئی ہے''۔

اگر فاضل مضمون نگار کو راقم سطور کے خیال سے اتفاق نہ ہو تو پھر وضاحت فرمائیں کہ منقولہ بالا آیات کا وہ کیا مفہوم سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان سوالات کے جواب بھی مرحمت فرمائیں جو میں نے ان ہی کی تحریر کی روشنی میں مرتب کیے ہیں۔ تاکہ میرے علاوہ دوسرے قارئین کو بھی اس باب میں اطمینان خاطر حاصل ہو۔ خاکسار الطاف احمد اعظمی

قرآن مجید اور تخلیق کائنات

۱/۳، دوسرا کراس
بڑی میٹ، چینئی -۳

محترم المقام جناب مدیر صاحب (ماہنامہ معارف) اعظم گڈھ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج شریف! ناچیز ماہنامہ معارف کا کوئی باقاعدہ قاری نہیں ہے۔ نہ ہی اس کا شمار کسی بھی طرح کے اہل علم میں ہوتا ہے۔ میں صرف عربی زبان کا ایک وظیفہ یاب لکچرار ہوں۔ البتہ حال ہی میں میں نے اپنے ایک کرم فرما کی تحسین وتحریک پر ماہنامہ ہذا میں سن ۲۰۰۸ء اور

۲۰۰۹ء کے دوران شائع شدہ فرقانیہ اکیڈمی بنگلور کے ناظم عالی جناب مولانا سعید الرحمٰن ندوی کے سلسلہ وار مضامین کا بغور مطالعہ کیا، اس کے اختتام پر میرے جذبات و احساسات اس طرح ہیں:

۱- تاریخ تفسیر کے قدیم و جدید کل چودہ سو سالہ ذخیرہ کے مطالعہ سے یہی پتہ چلتا ہے کہ اس کائنات میں سورج، چانداور زمین صرف ایک ایک ہی ہیں۔ کائنات کی تخلیق کے بعد انسان محض چند ہزار سال قبل ہی آسمان سے صرف ہماری موجودہ زمین پر اتارا گیا ہے۔ اب ہم کسی بھی وقت کائنات کے اچانک اختتام اور وقوع قیامت کے منتظر ہیں۔ اس طرح کل کائنات کی تخلیق صرف موجودہ انسان کی پیدائش و آزمائش کی خاطر کی گئی ہے۔

۲- بعض مفسرین سات زمینوں کے قائل رہے ہیں۔ مگر ان کے کلام میں کہیں بھی یہ بحث ہمیں قطعاً نہیں ملتی ہے کہ یہ زمینیں کہاں ہیں، ان کی بھی تخلیق کا خدائی مقصد کیا ہے، ان میں کون آباد ہیں، کیا ممکنہ طور پر ان میں آباد مخلوقات کی ابتدا اور انتہا بھی ٹھیک ہماری ہی طرح ہوگی، کیونکہ ہم پر وارد ہونے والی ٹھیک اسی متوقع قیامت کو ان پر بھی وارد ہونا ہے، یہ اس لیے کہ قیامت صرف ایک ہوگی اور وہ ساتوں آسمانوں اور ان کے کل موجودات پر محیط ہوگی۔ اس سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ اب تک ہم نے قرآن مجید کو کل کائنات میں صرف ایک سورج، ایک چاند، ایک زمین اور مکلّف مخلوقات کے صرف اسی ایک زمین پر ہونے کے پس منظر ہی میں سمجھا تھا۔

۳- مضمون نگار مولانا ندوی صاحب نے کتاب الٰہی کا جس قدر عمیق مطالعہ کیا ہے اور اس کی گہرائیوں میں جا کر کائنات میں زمینوں کی بے انتہا کثرت، خود زمینوں کی موت و حیات اور ان میں بھی انسانی مخلوقات کی مسلسل تخلیق و آزمائش پر کتاب الٰہی سے جو دلائل و شواہد مہیا کیے ہیں اور جن نادر و نایاب موتیوں کو برآمد کیا ہے اور موجودہ سائنسی دور میں صحیفہ خداوندی کا جو علمی و عقلی چہرہ بے نقاب کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ موجودہ دور میں قرآن مجید کا سب سے بڑا علمی معجزہ ہے۔

۴- مضمون نگار نے زمینوں کی کثرت پر جن آیات قرآنی سے استدلال کیا ہے ان میں سے اکثر وہ ہیں جو کبھی متقدم مفسرین کے زیر بحث آئی ہی نہیں، یعنی ہمیں اب تک قطعاً یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ آیا یہ آیات بھی کسی طرح زمینوں کی کثرت سے بحث کرتی ہیں۔

۵- جب ہمیں اب تک خارجی زمینوں ہی کا علم حاصل نہیں تھا تو خود ان میں بسی مخلوقات کا کیسے حاصل ہوسکتا ہے؟ لہٰذا مضمون نگار نے انسان کے تعدد تخلیق پر قرآنی دلائل کا جو انبار لگا دیا ہے اور مختلف گوشوں سے ایک الگ ہی فلسفہ حیات کو مرتب کیا ہے وہ بالکل نیا ہے اور کسی بھی طرح ناقابل التفات نہیں ہے۔ بلکہ وہ مضمون نگار کی توجیہ کے مطابق عین حکمت الٰہی کو ظاہر کرنے والا ہے، جسے قرآن مجید (سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِي اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ) کے ذریعہ بیان کرتا ہے۔ انہوں نے اس کے ذریعہ باری تعالیٰ کے عدل وانصاف کا جو مظاہرہ ہمارے سامنے کیا ہے وہ بے نظیر ہے۔ مجھے حیرت اس بات کی ہورہی ہے کہ اب تک کسی بھی اہل قلم نے اس پر اپنی رائے کا اظہار کیوں نہیں کیا ہے۔ کیا یہ دلائل اس قابل ہیں کہ ان سے صرف نظر ممکن ہے؟ میں ڈاکٹر صالح شریف کے اس تبصرہ سے پوری طرح متفق ہوں کہ جس کام کے لیے ساری مغربی دنیا یک سو ہوکر بھی اپنے آپ کو بے سروسامان محسوس کرے اسے ہمارا ایک کمسن فرد واحد نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے دے وہ جدید دور میں صرف کتاب خداوندی ہی کا معجزہ ہوسکتا ہے۔

طول بیانی کے لیے معافی کا خواستگار بھی ہوں۔ فقط

معین اللہ قاسمی

مطبوعات جدیدہ

میر کارواں ابو الکلام آزاد : از پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۲۴، قیمت ۴۰۰ روپے، پتہ : ذکری انٹرنیشنل پبلیشرز، وحید کتب مارکیٹ، ۵۲۳، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی - ۶ ۔

مولانا ابو الکلام آزاد کی عہد ساز اور عبقری شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں کا مطالعہ اور بعض موافق و مخالف تحریروں کا تجزیہ اس کتاب کا اصل موضوع ہے، مذہب، ادب، سیاست اور ذاتی اخلاق واحوال پر محیط یہ مطالعہ و تجزیہ وقتی نہیں بلکہ نصف صدی کے مسلسل اور مستقل غور وفکر کا نتیجہ ہے، مطالعہ آزاد کے اس امتیاز میں فاضل مصنف کے علاوہ صرف ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری ہی شریک نظر آتے ہیں، لیکن ہندوستان میں بہرحال یکتائی کا وصف فاضل مصنف ہی کو حاصل ہے، میر کارواں کے عنوان سے انہوں نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ فکر، جذبہ اور اس کی صلابت و استقامت کے نمونے کے لیے انہوں نے وہی راہ منتخب کی جس کی رہبری مولانا آزاد کو زیبا تھی، انہوں نے نہایت صداقت سے اپنے میر کارواں کے ہر نقش قدم کو اپنے قلم کی چمک بخشی اور برملا اظہار کیا کہ عالم اور ادیب تو اور بھی تھے، مولانا آزاد سے عقیدت و محبت ان کے سیاسی افکار و اعمال سے استوار ہوئی، ۴۵ء میں جب کہ فاضل مصنف کی نوعمری کا زمانہ تھا، ان کی جبین نیاز نے اعتراف کر لیا تھا کہ جا ایں جا است ۔ انہوں نے ۵۱ء میں مولانا آزاد کے تعلق سے پہلا مضمون لکھا تب سے ۲۰۰۶ء تک ان کے قلم سے اس کلامی مطالعہ میں بیسیوں مضامین نکلے جو اس کتاب میں جمع کر دیے گئے ہیں، شخصیت، رسائل، تصنیفات، خطوط، معاصرین و احباب کے علاوہ مولانا آزاد کے متعلق چند اہم کتابوں پر تبصروں نے اس کلامی مجموعہ مضامین کو کمال جس طرح عطا کیا ہے اس کا اندازہ کتاب پڑھنے سے ہی ممکن ہے، فضائل و محاسن کے علاوہ انہوں نے مولانا آزاد کے متعلق غلط فہمیوں بلکہ کذب بیانیوں اور بہتان طرازیوں کا جس طرح دفاع اور رد و ازالہ کیا ہے اس کے متعلق درست کہا گیا کہ ہندوستان میں ان کا قلم سب سے موثر قلم ثابت ہوا۔ فاضل مصنف کے جدامجد نواب حبیب الرحمٰن خاں، غبار خاطر کے

خطوں کے مخاطب تھے، لیکن یہ خطوط، چھپنے کے بعد ہی نواب صاحب مرحوم کی نظر سے گزرے، فاضل مصنف نے ان خطوط کو خود کلامی سے تعبیر کرتے ہوئے انشائیے کے زمرے میں شامل کیا ہے، لیکن ایک دوسری جگہ طبیعت کا بار ہلکا کرنے کا مقصد بتاتے ہوئے یہ الفاظ بھی ان کے قلم سے نکلے کہ ''مولانا سب سے زیادہ غبار خاطر میں کھل کھیلے ہیں''، مضامین چونکہ نصف صدی پر محیط ہیں اس لیے قدرتاً زمانی اثرات کارفرما ہیں اور خود مصنف محترم نے اس سے انکار نہیں کیا، جیسے ۵۸ء کے ایک مضمون میں ان کا خیال ہے کہ اگر مولانا آزاد اس درجہ خود دار اور کم آمیز نہ ہوتے تو ان کا مقام کسی طرح گاندھی سے کم نہ ہوتا، لیکن بعد کی بعض تحریروں میں وہ مولانا آزاد کی قامت کی درازی کو گاندھی سے کم نہیں سمجھتے، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی کتاب ذکر آزاد کا مطالعہ اس لیے بھی خاصا دلچسپ اور اہم ہے کہ واقعات و روایات کے استناد اور صحت و سقم میں یہ جرح و محاکمہ کا موضوع رہی ہے، فاضل مصنف نے ایک جگہ بجا طور پر لکھا ہے کہ ''افسوس اس کا ہے کہ مولانا آزاد کے بعض مخالفوں کا ذکر کرتے ہوئے ملیح آبادی کا قلم حد اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے''، لیکن بہتوں کے لیے یہ خیال بھی غالباً حد اعتدال سے متجاوز ہوگا کہ اردو نثر کے دو معمار ہیں ایک سرسید اور دوسرے ابوالکلام آزاد۔ مگر ایسے مقامات کم ہیں، زیادہ تر نتائج مطالعہ ایسے ہیں جو گہرے تجزیے اور اصابت رائے کی وجہ سے قاری کے ذہن کو سلامت اور صحت کی نعمت عطا کرتے ہیں مثلاً یہی کہ ''مولانا آزاد کی فکر، سرسید کی فکر کی توسیع نہیں تھی، تفسیر القرآن کا سارا زور عقلیت پر ہے اور ترجمان القرآن کا آفاقیت پر''، ۵۶ء کے ایک مضمون میں مولانا آزاد کی دو تقریروں کے بارے میں لکھا گیا کہ یہ حصول آزادی کے بعد ''بہت زبردست تقریریں'' تھیں، ایک تو وہی مشہور، دہلی کی شاہ جہانی مسجد والی، دوسری، پارلیمنٹ میں دارالمصنّفین کی اعانت کے لیے وہ تقریر جس کے متعلق اسٹیٹس مین میں لکھا گیا کہ ''کسی بھی پارلیمنٹ ہاؤس میں کبھی بھی اس سے زبردست تقریر مشکل ہی سے کی گئی ہوگی......اس کے تاثر کا یہ عالم تھا کہ ساری سابقہ روایات کو توڑ کر خود وزیراعظم نہرو دوسرے تالی بجانے والوں کے ساتھ شریک ہو گئے تھے''، اب کتنوں کو تقریر کے اس عالم کا علم ہے؟ فاضل مصنف کی تحریروں کی نمایاں خوبی، جرأت و صداقت کا برملا اظہار ہے، ۵۲ء کی ایک تحریر اتحاد و ترقی کا نقیب کے عنوان سے ہے، اس کے آغاز میں انہوں نے

''سرسید کی بلند و بالا شخصیت کو متضاد عناصر کا عجیب و غریب مجموعہ'' قرار دے کر جو لکھا حق یہ ہے کہ یہ ان ہی کا حق ہے، لکھتے ہیں جب (سرسید نے) علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد رکھی تو وہ صرف ہندی مسلمانوں کی ایک اعلیٰ مغربی درس گاہ کی بنیاد ہی نہیں ثابت ہوئی بلکہ ایک طرف مسلمانوں کی نئی نسلوں کی ذہنی ترقی پسندی اور دوسری طرف ان کی سیاسی پس ماندگی کی خشت اول بھی ثابت ہوئی''، پوری کتاب عقیدت آمیز معروضی مطالعہ کا بہترین نمونہ ہے، کہیں کہیں جوش کا وفور ہے لیکن دلائل کی قوت سے یہ جوش بھی معقول ہو جاتا ہے جیسے سیاسی فہم و تدبر اور ہندوستانی قومیت کو مستحکم کرنے کا مولانا آزاد کا کارنامہ اتنا وقیع ہے جس کے دوبارہ ظہور میں آنے کا اب کوئی امکان نہیں۔ اس نہایت وقیع کتاب کے لیے مختصراً وہی جملہ مستعار لیا جاسکتا ہے جو ''اظہار خیال'' میں ظاہر کیا گیا کہ یہ آزاد فہمی کے باب میں ایک بے نظیر کاوش ہے۔

اردو کے خطبات آزادی کی تدوین: از ڈاکٹر سلیم احمد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۳۷۲، قیمت ۴۰۰ روپے، پتہ: دانش محل، امین آباد لکھنؤ اور ادبی مرکز، جامع مسجد اردو بازار، گورکھپور۔

بعض کتابیں اپنے موضوع کے حسن انتخاب کی وجہ سے چونکانے والی ہی نہیں، حیرت انگیز مسرت کا سبب بھی بن جاتی ہیں، ہندوستان کی تحریک آزادی کے مختلف بلکہ بے شمار پہلوؤں پر کتابوں کا ایک سلسلہ جاری ہے، اردو کی دنیا بھی اس سلسلہ سے کبھی جدا نہیں ہوئی، لیکن تحریک آزادی کے مطالعات کا یہ گوشہ واقعی اب تک پردہ خفا میں تھا کہ کانگریس، جمعیۃ علمائے ہند، تحریک خلافت، مسلم لیگ، کمیونسٹ پارٹی جیسی جماعتوں کے سالانہ اجلاس میں پیش کیے جانے والے صدارتی یا کلیدی خطبات کیا تھے اور کس شان کے تھے؟ اس کتاب کے لائق مولف نے پی ایچ ڈی کے لیے یہی موضوع منتخب کیا ان کی خوش نصیبی تھی کہ پروفیسر محمود الٰہی جیسے دیدہ ور اور محقق گر استاذ کی رہنمائی حاصل ہوئی، نتیجہ میں ایک اہم موضوع پر بڑی قیمتی کتاب سامنے آگئی جس میں حکیم اجمل خاں، مولانا آزاد، مولانا جوہر، مولانا محمود حسن، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر مختار انصاری، مولانا حسرت موہانی جیسی شخصیتوں کے گویا نایاب خطبے ایک بار پھر متاع گم گشتہ کی بازیافت بن گئے، جن کی روشنی میں آج بھی ہندوستان اپنی اصل منزل کو پاسکتا ہے،

مولانا آزاد کا رام گڑھ کا خطبہ صدارت آج بھی اس لائق ہے کہ پورا ملک اور خاص طور پر مسلمان اپنی سیاسی پس ماندگی کے اسباب اوران کے تدارک کا اصل سراغ پا سکتے ہیں، لائق مولف نے پی ایچ ڈی کے مقالے کی بنیادی ضرورتوں پر بھی محنت کی ہے اور تحریک آزادی کے مختصر جائزے کے ساتھ خطبہ کی ماہیت اور مختلف سیاسی تحریکوں کے خطبات کا تقابلی مطالعہ اوران کی انفرادی خصوصیات بیان کی ہیں اور دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ اردو نثر کے اسالیب پر خطبات کے اثرات اوران کی ادبی اہمیت کی بھی نشان دہی کی ہے۔ اس مفید اور منفرد جستجو کے لیے لائق مولف واقعی مبارک باد کے مستحق ہیں اوران کا شعبہ بھی جس نے تحقیقی مقالات کے معیار کو وقار بخشا ہے۔

آئینِ نو اردو ترجمہ القاہرۃ الجدیدہ: از ڈاکٹر محمد فیضان بیگ، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۶۴، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: عریش روڈ نمبر ۴، اقرا کالونی نیو سرسید نگر، علی گڑھ اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔

آئین نو کے نام سے نہیں کھلتا کہ یہ کسی ناول کا نام ہے، لیکن مصر کے مشہور ناول نگار نجیب محفوظ کے مشہور ناولوں میں ایک القاہرۃ الجدیدہ کا یہ اردو نام، اپنے کرداروں، ماحول اور سماجی عکاسی کے لحاظ سے پوری طرح ہم آہنگ ہے، گذشتہ صدی کے نصف اول میں یورپ کے زیرسایہ واثر مصری معاشرہ خصوصاً اس کی نئی نسل کن حالات سے دوچار تھی اور زوال پذیر معاشرہ میں حکومت سے عام سماجی زندگی تک کیسی ہلچل تھی، ان سب کی عکاسی اس ناول میں بڑی خوبی سے کی گئی ہے، دولت واقتدار کی ہوس میں اقدار کی پامالی کی یہ داستان اردو دنیا کے لیے ذرا اجنبی نہیں، نام اور مقامات ضرور مصری ہیں لیکن ماحول وہی ہے جن سے ہندوستان گذشتہ صدی میں دوچار رہا اور بڑی حد تک اب بھی وہ اسی کشمکش سے گزر رہا ہے، نجیب محفوظ کا یہ پہلا ناول ہے جسے اردو میں پیش کیا گیا ہے، ترجمے کا اپنا رنگ ہوتا ہے، ہزار کوشش کے باوجود بہرحال یہ طبع زاد نہیں ہوسکتا، لیکن لائق مترجم نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ ناول کے ماحول میں قاری کو اجنبیت کا احساس نہ ہو، نجیب محفوظ مشکل مقامات پر بے حجابی سے محفوظ نہیں رہتے لیکن مترجم کی اخلاقیات نے نقالی کی ایسی اجازت نہیں دی، اس لیے وہ مجوبانہ ہی سہی ایسے مقامات کو زیرنقاب کرتے گزر گئے ہیں۔ ناول سماجی تاریخ نویسی کا اہم ذریعہ ہیں، اس ناول سے مصر کی عام سماجی

حالت سے عبرت حاصل کی جاسکتی ہے، ناول نگار اور مترجم کا منشا بھی غالباً یہی ہے۔

آئینہ برگ گل : از ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، متوسط تقطیع، عمدہ کاغد، خوبصورت طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۰۸، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ مومن پورہ، ناگ پور ۴۴۰۰۱۸۔

مشکلات، اذیتوں اور روح فرسا حادثوں سے گزرتے ہوئے اردو زبان و ادب کی مسلسل خدمت کرنے والوں میں اگر کبھی غیر معمولی صاحبان ہمت وعزیمت کا شمار ہوگا تو ایک نام شرف الدین ساحل کا اس میں ضرور شامل ہوگا، ۶۴ء سے ان کے ادبی سفر کا آغاز ہوا اور یقین نہیں آتا کہ پندرہ سال کی عمر سے اس شوق میں کیا تڑپ تھی کہ تحقیق، تنقید، تاریخ، صحافت، تذکرہ اور شاعری میں ان کی بتیس کتابیں شائع ہوئیں، زیر نظر مجموعہ کلام بظاہر ان کا تینتیسواں پارہ ادب ہے لیکن اصلاً یہ ان کے تین شعری مجموعوں یعنی دست کوہکن، شرار جستہ اور آئینہ سیما کا انتخاب ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ مجموعے مقبول ہوئے اور اب آسانی سے دستیاب نہیں، مزید کچھ کلام بھی شامل ہے، ساحل صاحب کی شاعری اس صداقت پر قائم ہے جو عملی زندگی کے تجربات ومشاہدات کی شاہد ہے، اصلاحی واخلاقی شاعری کو وہ ایک بنیادی فرض سمجھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ

فتنہ زندگی قیامت ہے ہر قدم پر صلیب ہے یارو
جس کو نغمہ سمجھ رہے ہو تم نالہ عندلیب ہے یارو

یہ احساس بھی دیکھیے کہ

ملنے کی آرزو تو بہت ہے فقیہہ سے لیکن یہ سوچتا ہوں کہ وہ کم نظر نہ ہو

کرب، اضطراب، شورش اور سوزش سے لبریز یہ اشعار دل کی دنیا میں اترنے میں کامیاب ہیں۔

اصل نغمات ہے یہی ساحل سوز غم سینۂ رباب میں ہے

ع-ص

رسید مطبوعہ کتب

۱- **انمول موتی (جلد دوم)**: ڈاکٹر صادق حسین ایم بی بی ایس، ملنے کا پتہ اور قیمت درج نہیں۔

۲- **پروفیسر محمد سمیع اللہ اسد۔ اظہار و آثار**: پروفیسر احمد سجاد، عرفان پبلی کیشنز، ۲/۲۷ سالٹ لیک سٹی، کولکاتا ۶۴۔ قیمت ۱۵۰ روپے۔

۳- **تحریک مجاہدین (جلد پنجم)**: ڈاکٹر صادق حسین ایم بی بی ایس، ملنے کا پتہ اور قیمت درج نہیں۔

۴- **تذکرۃ القراء**: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، عقب آواس وکاس کالونی، شہر اعظم گڑھ و دار المصنّفین شبلی اکیڈمی، پوسٹ بکس نمبر ۱۹، اعظم گڑھ۔ قیمت ۱۲۳ روپے۔

۵- **زاویۂ نظر**: ڈاکٹر شفیق اعظمی، مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔ قیمت ۵۰ روپے۔

۶- **شمس الرحمٰن فاروقی محو گفتگو (جلد اول)**: رحیل صدیقی، شب خون، کتاب گھر، الہٰ آباد، انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، نئی دہلی۔ قیمت ۱۸۰ روپے۔

۷- **فقہی اختلاف اور شاہ ولی اللہ کا موقف**: محمد فہیم اختر ندوی، اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۱۷۸۱، حوض سوئیوالان، نئی دہلی۔ قیمت ۴۵ روپے۔

۸- **گجرات کے مشاہیر علماء**: ڈاکٹر محمد زبیر قریشی، اردو ساہتیہ اکیڈمی گجرات۔ قیمت درج نہیں۔

۹- **مولانا ابوالکلام آزاد ایک مطالعہ**: ڈاکٹر بشریٰ رحمٰن، ادبی مرکز نزد جامع مسجد، اردو بازار، گورکھپور۔ قیمت ۱۵۰ روپے۔

۱۰- **مولانا شمس الحق عظیم آبادی، حیات اور خدمات**: محمد عزیز، علمی اکیڈمی ۹/۶۶۷ دستگیر کالونی، فیڈرل بی ایریا کراچی ۳۸۔ قیمت ۳۵ روپے۔